تعمیر شخصیت کے آفاقی اصول

کوڈ نمبر:4930

یونٹ:1 تا9

بی ایس علوم اسلامیہ

شعبہ فکر اسلامی، تاریخ وثقافت
کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ
علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

تعمیر شخصیت کے آفاقی اصول

بی ایس (علوم اسلامیہ)

کورس کوڈ: 4930

یونٹ: 1تا9

تالیف و ترتیب

ڈاکٹر حافظ طاہر اسلام عسکری

کلیۂ عربی و علوم اسلامیہ

شعبہ فکرِ اسلامی، تاریخ و ثقافت

علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد

(جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں)

سال اشاعت: 2025ء

لے آؤٹ: محمد ضیاء اللہ

نگران طباعت: ڈاکٹر سرمد اقبال

طابع: پرنٹنگ پریس علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

ناشر: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کورس ٹیم

چیئرمین	پروفیسر ڈاکٹر محی الدین ہاشمی ڈین کلیۂ عربی وعلوم اسلامیہ
مصنفین	ڈاکٹر محمود احمد ڈاکٹر محمد منشا طیب
نظر ثانی	ڈاکٹر طاہر اسلام عسکری ڈاکٹر محمد افضل ڈاکٹر حامد حماد ڈاکٹر نوید اقبال
حروف چینی	طاہر اسلام خالد لطیف
تزیین	عثمان ساجد

تقدیم

انسانی تہذیب کا اصل سرمایہ وہ اخلاقی اور فکری اصول ہیں جو انسان کی شخصیت کو نکھارتے اور معاشرے کو استحکام دیتے ہیں۔ مختلف ادوار میں فلسفوں، مذاہب اور معاشرتی نظاموں نے انسانی کردار کی تعمیر کے لیے جو رہ نما خطوط متعین کیے ان سب کی بنیاد میں کچھ مشترک آفاقی قدریں کار فرما ہیں۔ اسلام نے انھی قدروں کو جامع اور متوازن شکل میں پیش کر کے انسان کو داخلی اور خارجی زندگی کے توازن کا عملی نمونہ دیا ہے۔

علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی کے اس کورس **تعمیرِ شخصیت کے آفاقی اصول** میں یہی پہلو اجاگر کیا گیا ہے کہ سیرت و کردار کی تعمیر کے یہ آفاقی اصول کسی ایک تہذیب یا مذہب تک محدود نہیں بل کہ تمام انسانوں کے درمیان مشترک اساس رکھتے ہیں۔ اس نصاب میں اسلامی تعلیمات کو مرکزی حوالہ بنایا گیا ہے اور ساتھ ہی یہ دکھایا گیا ہے کہ عدل، صداقت، دیانت، احترامِ انسان، خدمتِ خلق، خود احتسابی اور کردار کی درستی جیسے اوصاف مختلف تہذیبوں، فلسفوں اور اخلاقی نظاموں میں قدرِ مشترک کے طور پر موجود ہیں۔ ڈاکٹر حافظ طاہر اسلام عسکری نے اس نصاب کی ترتیب میں تعمیرِ شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اسلامی تعلیمات اور انسانی تجربے کی آفاقی قدروں کے امتزاج سے نہایت سلیقے اور فکری توازن کے ساتھ یک جا کیا ہے۔

یہ نصاب بی ایس علومِ اسلامیہ کے طلبہ کے لیے اس فکری ہم آہنگی اور اخلاقی توازن کا ضامن ہے جو ایک صالح، بامقصد اور ہمہ گیر شخصیت کے لیے ناگزیر ہے۔ توقع کی جاتی ہے کہ اس سے نہ صرف طلبہ کی علمی بصیرت میں اضافہ ہو گا بل کہ ان کے اندر وہ اخلاقی پختگی بھی پیدا ہو گی جو ایک باشعور، ذمہ دار اور خدمت گزار شہری کی پہچان ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر محی الدین ہاشمی
صدرِ شعبۂ فکرِ اسلامی، تاریخ و ثقافت
ڈین، کلیۂ عربی و علوم اسلامیہ
علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد

کورس کا تعارف

انسانی شخصیت وہ کل ہے جس میں عقل، جذبہ، ارادہ اور عمل ایک باہمی توازن کے ساتھ کار فرما رہتے ہیں۔ یہ توازن بگڑ جائے تو انسان کی فکری سمت، اخلاقی مزاج اور عملی رویّہ سب متاثر ہو جاتے ہیں۔ تعمیرِ شخصیت دراصل اسی توازن کو بحال رکھنے کا عمل ہے تاکہ فرد اپنی ذات، اپنے ماحول اور اپنے کردار میں ہم آہنگی پیدا کر سکے۔

یہ نصاب اسی فکری رشتے کی تفہیم پر مبنی ہے۔ اس کا آغاز اس بات سے ہوتا ہے کہ شخصیت کیا ہے اور زندگی کے مختلف پہلوؤں میں اس کی اہمیت کہاں تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے بعد ان بنیادی اصولوں پر گفت گو کی گئی ہے جن پر ہر پختہ اور باوقار شخصیت کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔

کورس کے درمیانی یونٹس میں انسانی کردار کو عملی سطح پر جانچا گیا ہے۔ سماجی، کاروباری، سیاسی اور پیشہ ورانہ اخلاقیات کے مباحث اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ انسان کا رویّہ جہاں بھی ظاہر ہو وہاں عدل، دیانت، احترامِ انسان اور فرض شناسی اس کے کردار کا حصہ بنیں۔

اختتامی حصے میں معاشرتی حقوق و فرائض، سوشل میڈیا کے آداب و ضوابط اور رذائلِ اخلاق کی اصلاح جیسے موضوعات جدید زندگی کے بدلتے ہوئے حالات کے تناظر میں پیش کیے گئے ہیں۔ یہ مباحث فرد کو اس سطح پر لاتے ہیں جہاں وہ خود اپنی شخصیت کی کم زوریوں کا احساس کر کے ان کی درستی کی طرف بڑھتا ہے۔

یہ نصاب انسانی زندگی کے مختلف دائرۂ عمل کو ایک مربوط زاویے سے سمجھنے کا موقع فراہم کرتا ہے تاکہ فرد خود شناسی سے آگے بڑھ کر کردار کی مضبوطی اور فکری اعتدال حاصل کر سکے۔

ڈاکٹر حافظ طاہر اسلام عسکری

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ فکرِ اسلامی، تاریخ و ثقافت / کورس رابطہ کار

کورس کے مقاصد

امید ہے کہ اس کورس کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو سکیں گے کہ

1) شخصیت کے بنیادی مفاہیم، عناصر اور ساخت کی وضاحت کر سکیں۔
2) تعمیرِ شخصیت کے آفاقی اصولوں کو فکری، اخلاقی اور عملی سطح پر بیان کر سکیں۔
3) انسانی کردار میں توازن، ضبط، سچائی اور دیانت جیسے اوصاف کی اہمیت واضح کر سکیں۔
4) سماجی، کاروباری، سیاسی اور پیشہ ورانہ اخلاقیات کے بنیادی تقاضوں کو سمجھ سکیں۔
5) معاشرتی حقوق و فرائض کے باہمی تعلق اور ان کے توازن کی نشان دہی کر سکیں۔
6) سوشل میڈیا کے مثبت استعمال اور اس کے اخلاقی ضوابط پر گفت گو کر سکیں۔
7) رذائلِ اخلاق کی مختلف صورتوں اور ان کے تدارک کے عملی طریقوں کا تجزیہ کر سکیں۔
8) انسانی شخصیت کی تعمیر میں اخلاقی خود احتسابی اور کردار سازی کے اصولوں کو برت سکیں۔
9) شخصی و اجتماعی سطح پر ایک متوازن، مہذب اور ذمے دار طرزِ عمل اپنانے کی صلاحیت پیدا کر سکیں۔

یونٹ کی فہرست

یونٹ نمبر	نام یونٹ	صفحہ نمبر
.1	تعمیر شخصیت: تعارف واہمیت	01
.2	تعمیر شخصیت کے اصول	19
.3	سماجی اخلاقیات	33
.4	کاروباری اخلاقیات	49
.5	سیاسی اخلاقیات	69
.6	پیشہ ورانہ اخلاقیات	89
.7	معاشرتی حقوق وفرائض	109
.8	سوشل میڈیا کا استعمال: آداب وضوابط	137
.9	رزائلِ اخلاق اور ان کی اصلاح	157

یونٹ: 1

تعمیر شخصیت: تعارف واہمیت

تحریر: ڈاکٹر منشاطیب
نظر ثانی: ڈاکٹر حامد حماد

فہرست عنوانات

1- تعمیرِ شخصیت: مفہوم اور بنیادی خدوخال 6

1.1- شخصیت کی لغوی اور اصطلاحی تعریف 6

1.2- شخصیت کے بنیادی عناصر 8

1.3- شخصیت کی اقسام اور ان کی خصوصیات 9

1.3.1- فطری رجحان کے اعتبار سے شخصیت کی اقسام 9

1.3.2- اخلاقی و فکری رجحان کے اعتبار سے شخصیت کی اقسام 10

1.3.3 - دینی و روحانی مزاج کے اعتبار سے شخصیت کی اقسام 10

2- تعمیرِ شخصیت کے بنیادی عوامل 10

2.1- فطری ساخت 11

2.2- خاندانی پس منظر 11

2.3- تعلیمی و فکری اثرات 11

2.4- سماجی ماحول 11

2.5- ذاتی جدوجہد اور ارادے کی قوت 12

3- شخصیت کی تعمیر میں عملی اقدامات 12

3.1- ذہنی وسعت اور مطالعہ 12

3.1.1- مطالعے کے فوائد 12

3.1.2- مطالعے کے ذرائع 13

3.1.3- مطالعے کی عادت اپنانے کے طریقے 13
3.2-مثبت طرزِ فکر 13
3.2.1- مثبت طرزِ فکر کے فوائد 14
3.2.2- مثبت طرزِ فکر پیدا کرنے کے عملی طریقے 14
3.3-سماجی میل جول 14
3.3.1- سماجی میل جول کی اہمیت 14
3.3.2-سماجی مہارتیں بڑھانے کے طریقے 15
3.4-تنقیدی سوچ اور فیصلہ سازی 15
3.4.1- تنقیدی سوچ کی خصوصیات 15
3.4.2- تنقیدی سوچ پیدا کرنے کے طریقے 15
3.5- فیصلہ سازی کی مہارت 16
3.5.1- فیصلہ سازی کے بنیادی اصول 16
3.6- خود احتسابی(Self-Assessment) 16
3.6.1- خود احتسابی کی اہمیت 16
3.6.2- خود احتسابی کے عملی طریقے 17
3.6.3-خود احتسابی اور کامیابی 17
4-خلاصہ (Summary) 17
خود آزمائی(Self-Assessment) 18

یونٹ کا تعارف

انسانی زندگی میں شخصیت کی تشکیل ایک مسلسل جاری رہنے والا عمل ہے جو فرد کی پیدائش سے لے کر عمر کے ہر مرحلے میں مختلف تجربات، ماحول اور ذاتی کوششوں کے زیرِ اثر ترقی پذیر رہتا ہے۔ شخصیت محض ایک جامد تصور نہیں، بل کہ یہ ایک متحرک اور ارتقائی حقیقت ہے، جو انسان کے خیالات، جذبات، رویوں اور سماجی تعلقات سے متعین ہوتی ہے۔ کسی بھی معاشرے میں فرد کی کام یابی اور اس کے مثبت اثرات کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ اپنی شخصیت کو کس طرح منظم اور مستحکم کرتا ہے۔

اس یونٹ میں ہم تعمیرِ شخصیت کے بنیادی خدوخال پر تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔ سب سے پہلے شخصیت کی تعریف اور اس کے مختلف نظریاتی تصورات کو سمجھا جائے گا، تاکہ یہ واضح ہو کہ ماہرینِ نفسیات اور سماجیات نے شخصیت کو کن پہلوؤں سے دیکھا ہے۔ اس کے بعد شخصیت کی اہمیت پر گفتگو کی جائے گی کہ فرد کی ذاتی، پیشہ ورانہ اور سماجی زندگی میں ایک متوازن شخصیت کس قدر ضروری ہے۔ پھر ہم شخصیت کی مختلف اقسام پر بحث کریں گے تاکہ یہ واضح ہو کہ ہر انسان کی شخصیت ایک منفرد ساخت رکھتی ہے اور مختلف پہلوؤں سے تشکیل پاتی ہے۔ آخر میں ہم ان عوامل کا تجزیہ کریں گے جو شخصیت کی تعمیر میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں، جیسے وراثت، ماحول، تعلیم و تربیت، سماجی تجربات، اور فرد کی اپنی ذاتی کوششیں۔

یہ یونٹ طلبہ کے لیے ایک بنیاد فراہم کرے گا، جس پر آگے آنے والے ابواب میں تعمیرِ شخصیت کے عملی اصولوں اور ان کے اطلاق پر تفصیلی گفت گو کی جائے گی۔ اس مطالعے کے ذریعے طلبہ اپنی شخصیت کو بہتر انداز میں سمجھنے، نکھارنے اور زندگی کے مختلف شعبوں میں مؤثر کردار ادا کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔

یونٹ کے مقاصد

امید ہے کہ اس یونٹ کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1. شخصیت کے مفہوم اور اس کی ساخت کو درست طور پر سمجھ سکیں۔
2. شخصیت کی اہمیت اور اس کے سماجی و ذاتی اثرات کو واضح کر سکیں۔
3. شخصیت کی مختلف اقسام اور ان کی خصوصیات کی شناخت کر سکیں۔
4. تعمیرِ شخصیت کے بنیادی عوامل اور ان کے اثرات کا تجزیہ کر سکیں۔
5. اپنی شخصیت کی نشوونما کے لیے عملی اقدامات اور حکمتِ عملی وضع کر سکیں۔

1- تعمیرِ شخصیت: مفہوم اور بنیادی خدوخال

انسان کی شخصیت محض ظاہری عادات واطوار کا مجموعہ نہیں بل کہ اس کے باطن، فکر، جذبات اور ارادوں کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ ہر فرد کی شخصیت اس کے نظریات، رویوں اور طرزِ عمل سے تشکیل پاتی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ مختلف تجربات ومشاہدات کے زیرِ اثر ترقی پذیر رہتی ہے۔

شخصیت کی تعمیر دراصل ایک مسلسل ارتقائی عمل ہے، جو وراثت، ماحول، تعلیم و تربیت، اور فرد کی ذاتی سعی کے امتزاج سے وجود میں آتا ہے۔ یہ تعمیر جتنی متوازن اور مستحکم ہو گی، فرد اتنا ہی زیادہ مؤثر، باوقار اور سماجی اعتبار سے مفید ثابت ہو گا۔

آگے بڑھنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم شخصیت کے مفہوم کو واضح کریں اور یہ سمجھیں کہ اس کا دائرہ کار کن پہلوؤں پر محیط ہے۔ ماہرینِ نفسیات اور سماجیات نے شخصیت کی مختلف تعریفیں پیش کی ہیں جن میں سے بعض محض خارجی عوامل پر زور دیتی ہیں، جب کہ بعض باطنی کیفیات اور فکری ارتقا کو بنیاد بناتی ہیں۔ ان مختلف تصورات کو سمجھنا شخصیت کی تشکیل کے اصولوں کو سمجھنے میں مددگار ہو گا۔

1.1- شخصیت کی لغوی اور اصطلاحی تعریف

لفظ **شخصیت** عربی کے لفظ **شخص** سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں ظاہر ہونا یا نمایاں ہونا۔ لغوی اعتبار سے یہ لفظ کسی فرد کے ظاہری و باطنی مجموعے کو ظاہر کرتا ہے، جو اسے دوسرے افراد سے ممتاز بناتا ہے۔ انگریزی میں اس کے لیے **Personality** کا لفظ استعمال ہوتا ہے جو لاطینی زبان کے لفظ **Persona** سے نکلا ہے۔ قدیم رومی تھیٹر میں یہ لفظ اس نقاب کے لیے بولا جاتا تھا جو اداکار چہرے پر پہنتے تھے۔ اس معنی میں شخصیت کا تصور محض ظاہری تاثر تک محدود نہ رہا بل کہ اس میں باطنی کیفیات، فکری رجحانات اور اخلاقی اقدار بھی شامل ہو گئیں۔

اصطلاحی طور پر ماہرینِ نفسیات نے شخصیت کو مختلف انداز سے بیان کیا ہے۔ ان میں سب سے جامع اور معتبر تعریف گورڈن آلپورٹ (Gordon W. Allport) نے پیش کی جو شخصیت کی نفسیاتی ساخت کو ایک متحرک اور ہم آہنگ نظام کے طور پر دیکھتے ہیں۔ ان کے الفاظ میں:

"Personality is the dynamic organization within the individual

of those psychophysical systems that determine his unique adjustments to his environment."

(Allport, G. W. Personality: A Psychological Interpretation, p. 48)

یعنی شخصیت وہ متحرک تنظیم ہے جو فرد کے اندر موجود نفسی و جسمانی نظاموں پر مشتمل ہوتی ہے اور یہی نظام اس کے ماحول کے ساتھ منفرد مطابقت اور ردِ عمل کو متعین کرتے ہیں۔ آلپورٹ کی یہ تعبیر اس امر کو واضح کرتی ہے کہ شخصیت جامد نہیں بل کہ ایک ارتقائی اور متوازن عمل ہے جس میں جسم، ذہن، جذبات اور ارادہ، سب ایک دوسرے سے مربوط ہو کر ایک ہمہ جہت انسانی پیکر بناتے ہیں۔

اسلامی زاویے سے دیکھا جائے تو شخصیت کی اصل بنیاد عقیدہ، عمل اور اخلاق پر قائم ہے۔ قرآنِ کریم انسان کی کام یابی کو تزکیۂ نفس سے مشروط قرار دیتا ہے:

قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا (الشمس 9–10)

"بے شک وہ کام یاب ہوا جس نے اپنے نفس کو پاکیزہ کیا، اور نامراد ہوا جس نے اسے آلودہ کر لیا۔"

اسلامی روایت میں شخصیت کے لیے سب سے قریب تر لفظ "خُلق" ہے، جو کردار، عادت اور باطنی کیفیت کے مجموعے کو ظاہر کرتا ہے۔ امام ابو حامد الغزالیؒ نے خلق کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

الخُلُقُ عبارةٌ عن هيئةٍ في النفسِ راسخةٍ، عنها تصدرُ الأفعالُ بسهولةٍ ويُسرٍ من غيرِ حاجةٍ إلى فكرٍ ورويّة (إحياء علوم الدين، كتاب رياضة النفس و تهذيب الأخلاق)

یعنی خُلق نفس کی ایک پختہ کیفیت ہے، جس سے اعمال بغیر کسی تکلف اور غور و فکر کے سہولت کے ساتھ صادر ہوتے ہیں۔ اس تعریف کے مطابق اسلامی تصورِ شخصیت محض ظاہری برتاو یا نفسیاتی رجحان نہیں بل کہ باطنی تربیت، اخلاقی پختگی، اور روحانی تزکیے کا نام ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اسی باطنی کردار کو مقصدِ بعثت قرار دیتے ہوئے فرمایا:

»إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الأَخْلَاقِ« (الموطأ لمالک، کتاب حُسن الخُلق)

"مجھے بھیجا ہی اس لیے گیا ہے کہ میں اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کر دوں۔"

یوں دیکھا جائے تو اسلام میں شخصیت کا تصور محض نفسیاتی نہیں بل کہ ہمہ گیر اخلاقی و روحانی تعبیر رکھتا

ہے۔ حقیقی شخصیت وہ ہے جو عقیدے میں اخلاص، عمل میں استقامت، اور کردار میں پاکیزگی رکھتی ہو۔ اس طرح شخصیت انسان کی ظاہری عادات اور باطنی کیفیات دونوں کا حسین امتزاج بن جاتی ہے، جو انسان کو نہ صرف ایک بہتر فرد بناتی ہے بل کہ اسے معاشرے کے لیے نفع بخش اور باوقار وجود عطا کرتی ہے۔

1.2- شخصیت کے بنیادی عناصر

شخصیت کسی ایک پہلو کا نام نہیں بل کہ انسانی وجود کے مختلف عناصر کے متوازن امتزاج سے تشکیل پاتی ہے۔ ایک مکمل اور متوازن شخصیت کے لیے ضروری ہے کہ جسم، ذہن، اخلاق، معاشرت اور روح سب ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہوں۔

1. **جسمانی پہلو**

   صحت، توانائی اور جسمانی تندرستی شخصیت کی مضبوط بنیاد فراہم کرتی ہے۔ ایک متحرک اور صحت مند جسم اعتماد اور فعالیت پیدا کرتا ہے، جو فرد کی کارکردگی اور رویے پر براہِ راست اثر ڈالتا ہے۔

2. **نفسیاتی پہلو**

   خیالات، جذبات اور ذہنی کیفیت فرد کی شخصیت کا داخلی پہلو ہیں۔ مثبت سوچ، جذباتی توازن اور ذہنی سکون انسان کو فیصلہ سازی، تخلیقی صلاحیت اور خود اعتمادی میں مضبوط بناتے ہیں۔

3. **اخلاقی پہلو**

   دیانت، سچائی، انصاف اور ہمدردی جیسے اوصاف انسان کے کردار کو سنوارتے ہیں۔ یہ وہ اصول ہیں جو فرد کو اعتماد، احترام اور باوقار طرزِ زندگی عطا کرتے ہیں۔

4. **سماجی پہلو**

   انسان ایک سماجی وجود ہے، اس کے میل جول، تعلقات اور ذمہ دارانہ برتاؤ سے ہی اس کی اجتماعی شخصیت نکھرتی ہے۔ مثبت تعلقات، باہمی احترام اور تعاون معاشرتی ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں۔

5. **روحانی پہلو**

   روحانی توازن سے مراد وہ داخلی سکون ہے جو انسان کو زندگی کے مقصد، خود آگاہی اور اخلاقی حساسیت

کے احساس سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ پہلو شخصیت کو گہرائی، وقار اور معنی عطا کرتا ہے۔

ان عناصر کا باہمی توازن ہی ایک مکمل، متوازن اور پُراعتماد شخصیت کو جنم دیتا ہے۔ یہ امتزاج ہمیں یہ سمجھنے میں مدد دیتا ہے کہ شخصیت ایک جامع اور ہمہ گیر حقیقت ہے، جس کی تعمیر کے لیے جسمانی، ذہنی، اخلاقی، سماجی اور روحانی تمام جہتوں پر متوازن توجہ ضروری ہے۔

1.3- شخصیت کی اقسام اور ان کی خصوصیات

انسانی شخصیت ایک سادہ اور یک رخا مظہر نہیں بل کہ بے شمار جہات اور گوناگوں کیفیات کا مجموعہ ہے۔ مختلف افراد میں مزاج، رجحانات اور رویے ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں، اور اسی اختلاف کے پیش نظر ماہرینِ نفسیات اور سماجیات نے شخصیت کی مختلف اقسام متعین کی ہیں۔ ان اقسام کو سمجھنا نہ صرف خود شناسی کے لیے ضروری ہے بل کہ یہ دوسروں کے ساتھ بہتر تعلقات قائم کرنے میں بھی ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔

عموماً شخصیت کو تین بڑے زاویوں سے تقسیم کیا جاتا ہے:

1.3.1- فطری رجحان کے اعتبار سے شخصیت کی اقسام

انسان کے اندرونی رجحانات اور نفسیاتی میلان کو سامنے رکھتے ہوئے شخصیت کو درج ذیل تین اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

1. **باطن رُخ شخصیت (Introvert Personality)**

وہ افراد جو خلوت پسند ہوتے ہیں، زیادہ غور و فکر کرتے ہیں اور لوگوں کی بھیڑ میں اپنے آپ کو غیر آرام دہ محسوس کرتے ہیں، درون گرا کہلاتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے جذبات کا اظہار کم کرتے ہیں اور سوچنے کے بعد بولنے یا عمل کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

2. **بیرون رُخ شخصیت (Extrovert Personality)**

برعکس اس کے کچھ لوگ مجلس کے دل دادہ، زیادہ گفت گو کرنے والے اور ہر محفل میں نمایاں نظر آنے والے ہوتے ہیں۔ وہ لوگوں سے گھلنے ملنے میں جھجک محسوس نہیں کرتے اور اپنی توانائی کو سماجی تعلقات میں صرف کرتے ہیں۔

3. معتدل شخصیت(Ambivert Personality)

یہ وہ افراد ہوتے ہیں جو نہ مکمل طور پر باطن رخ ہوتے ہیں اور نہ ہی مکمل طور پر بیرون رخ بل کہ دونوں کے درمیان متوازن مزاج رکھتے ہیں۔ بعض اوقات وہ تنہائی پسند کرتے ہیں اور بعض اوقات محفل میں دل چسپی لیتے ہیں۔ یہ درمیانی قسم زیادہ تر افراد میں پائی جاتی ہے۔

1.3.2-اخلاقی و فکری رجحان کے اعتبار سے شخصیت کی اقسام

اخلاقی اور فکری سطح پر بھی شخصیت کو مختلف زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، جن میں نمایاں درج ذیل ہیں:

1. **نظریاتی شخصیت** جو حقائق اور اصولوں پر زیادہ زور دیتی ہے اور ہر معاملے کو ایک فکری اور منطقی زاویے سے دیکھتی ہے۔
2. **عملی شخصیت** جو زیادہ فکر و نظر کی بجائے عمل اور نتائج پر زور دیتی ہے اور فوری فیصلے لینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔
3. **جذباتی شخصیت** جو زیادہ تر احساسات، محبت، نفرت، ہمدردی اور جذباتی اثرات کے تحت زندگی گزارتی ہے۔

1.3.3 -دینی و روحانی مزاج کے اعتبار سے شخصیت کی اقسام

دین داری اور روحانی رجحان بھی شخصیت پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔اس لحاظ سے شخصیت کی تین بنیادی اقسام ہیں:

1. **عبادت گزار اور متقی شخصیت** جو خدا کے خوف، ایمانی بالیدگی اور اخلاقی پاکیزگی کو زندگی کا محور بناتی ہے۔
2. **ظاہری دین دار مگر بے عمل شخصیت** جو دین کا دعویٰ تو کرتی ہے مگر عمل کے میدان میں کم زور واقع ہوتی ہے۔
3. **غافل اور غیر سنجیدہ شخصیت** جو دینی و روحانی معاملات سے بے پرواہ اور دنیاوی لذتوں میں مگن رہتی ہے۔

یہ چند بنیادی اقسام ہیں، جن کی مدد سے ہم اپنے اور دوسروں کے رجحانات کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔اس تقسیم سے واضح ہوتا ہے کہ ہر انسان کی شخصیت میں ایک خاص رخ اور ایک مخصوص مزاج ہوتا ہے اور اگر ہم اپنی ذات کا صحیح ادراک کر لیں تو نہ صرف اپنی اصلاح کر سکتے ہیں بل کہ دوسروں کے ساتھ برتاو میں بھی حکمت و دانش سے کام لے سکتے ہیں۔

2- تعمیرِ شخصیت کے بنیادی عوامل(Key Factors in Personality Development)

انسانی شخصیت کوئی جامد حقیقت نہیں بل کہ ایک مسلسل تغیر پذیر مظہر ہے، جو مختلف داخلی اور خارجی عناصر کے زیرِ اثر نشو و نما پاتی ہے۔ یہ عناصر فرد کے طرزِ فکر، رویّے، عادات اور عملی زندگی پر گہرے اثرات

ڈالتے ہیں۔ ذیل میں ان بنیادی عوامل کا ذکر کیا جارہا ہے جو شخصیت کی تعمیر میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔

2.1- فطری ساخت

ہر انسان ایک مخصوص ذہنی و جسمانی ساخت لے کر پیدا ہوتا ہے۔ کسی کی طبیعت میں سنجیدگی اور گہرائی ہوتی ہے تو کسی میں شوخی اور سرگرمی۔ کوئی تیزی سے فیصلے کرتا ہے، تو کوئی غور و فکر کے بعد۔ یہ فطری مزاج شخصیت کی بنیاد رکھتا اور آئندہ کے رجحانات کو متعیّن کرتا ہے۔

2.2-خاندانی پس منظر

انسان کی ابتدائی تربیت کا مرکز اس کا گھر ہوتا ہے۔ والدین، بہن بھائی اور دیگر قریبی رشتے دار اس کی شخصیت کے اولین معمار ہوتے ہیں۔ بچپن میں سکھائی جانے والی قدریں اور عادات عمر بھر شخصیت کا حصہ رہتی ہیں۔ ایک صالح گھرانہ بچے میں دیانت، ایثار، ضبطِ نفس اور خود اعتمادی پیدا کرتا ہے بل کہ بگڑا ہوا ماحول شخصیت کو بگاڑنے میں دیر نہیں لگاتا۔

2.3- تعلیمی و فکری اثرات

انسانی ذہن ایک خالی تختی نہیں بل کہ ایک زرخیز زمین کی مانند ہے جس میں جو بیج بوئے جائیں، وہی پروان چڑھتے ہیں۔ تعلیم محض معلومات کا ذریعہ نہیں، بل کہ سوچنے، سمجھنے اور فیصلے کرنے کا شعور بھی عطا کرتی ہے۔ درست نظریے پر مبنی تعلیم بصیرت، اصول پسندی اور توازن پیدا کرتی ہے، جب کہ منفی نظریات ذہنی الجھاؤ اور بے سمتی کو جنم دیتے ہیں۔

2.4- سماجی ماحول

جس معاشرتی فضا میں انسان زندگی گزارتا ہے، وہ اس کے اخلاق، عادات اور رویّوں پر گہرے اثرات ڈالتی ہے۔ مہذب اور ذمہ دار معاشرہ سنجیدگی، دیانت اور اصول پسندی کی راہ دکھاتا ہے، جب کہ غیر ذمہ دار ماحول میں انسان خود بھی بے اصولی اور لاپرواہی کا شکار ہو جاتا ہے۔ دوستوں کی صحبت اور سماجی میل جول شخصیت کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

2.5-ذاتی جدوجہد اور ارادے کی قوت

شخصیت کی تعمیر میں سب سے اہم عنصر خود انسان کی کوشش ہے۔ وراثتی رجحانات، خاندانی پس منظر، تعلیم اور ماحول اپنی جگہ اثر رکھتے ہیں، مگر حقیقی تبدیلی تب ممکن ہے جب انسان اپنی کمزوریوں کو پہچان کر ان کی اصلاح کے لیے سنجیدہ کوشش کرے۔ ارادے کی پختگی، عزم کی مضبوطی اور مسلسل محنت وہ اوصاف ہیں جو شخصیت کی تعمیر میں فیصلہ کن کردار ادا کرتے ہیں۔

یہ وہ عوامل ہیں جو انسانی شخصیت کے خدوخال کو تشکیل دیتے ہیں۔ ایک صحت مند اور متوازن شخصیت کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنی فطری صلاحیتوں کو پہچانے، اپنے گرد و پیش کے اثرات کا جائزہ لے اور اپنی اصلاح کے لیے شعوری طور پر کوشاں رہے۔ جو افراد اس حقیقت کو سمجھ کر عمل کرتے ہیں، وہی مضبوط، متوازن اور کامیاب شخصیت کے مالک بنتے ہیں۔

3- شخصیت کی تعمیر میں عملی اقدامات

شخصیت کی تعمیر محض نظری پہلو نہیں بل کہ ایک عملی عمل ہے، جو مسلسل کوشش اور شعوری رویّے کا تقاضا کرتا ہے۔ انسان کی شخصیت جتنی وسیع فکر، مثبت سوچ، سماجی ربط، تنقیدی بصیرت اور خود احتسابی پر قائم ہو، اتنی ہی پختہ اور متوازن بن جاتی ہے۔

3.1- ذہنی وسعت اور مطالعہ

انسان کی شخصیت اس کے علم، فکر اور تجربات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ جس قدر کسی فرد کا ذہنی افق وسیع ہو، اسی قدر اس کی شخصیت میں پختگی اور نکھار پیدا ہوتا ہے۔ ذہنی وسعت کا سب سے بنیادی ذریعہ مطالعہ ہے۔ جو شخص مطالعے کو اپنی عادت بنالیتا ہے، اس کی فکر میں گہرائی اور رائے میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔

3.1.1- مطالعے کے فوائد

علم میں اضافہ : مطالعہ انسان کو نئی معلومات فراہم کرتا ہے، جس سے شخصیت علمی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔

تخلیقی صلاحیتوں میں اضافہ : وسیع المطالعہ فرد نئے خیالات اور تصورات کو بہتر طور پر سمجھنے اور اپنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

1. **تنقیدی شعور کی بیداری** : مختلف نظریات اور آرا کے مطالعے سے سوچ میں توازن اور گہرائی پیدا ہوتی ہے۔
2. **وسعتِ نظر** : وسیع علم رکھنے والا شخص زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بہتر طور پر سمجھتا ہے۔
3. **گفت گو میں روانی** : مطالعہ گفت گو میں تاثیر اور انداز میں شائستگی پیدا کرتا ہے۔

3.1.2- مطالعے کے ذرائع

1. **کتابیں** : دینی، سائنسی، ادبی اور فکری کتب انسان کی بہترین رہ نما ہوتی ہیں۔
2. **اخبارات و جرائد** : حالاتِ حاضرہ پر نظر رکھنے کا مؤثر ذریعہ ہیں۔
3. **آن لائن ذرائع** : انٹرنیٹ، ای بکس، اور تعلیمی ویب سائٹس جدید مطالعے کے اہم ذرائع ہیں۔
4. **اہلِ علم کی صحبت** : دانش مندوں کی گفت گو ذہنی وسعت پیدا کرتی ہے۔

3.1.3- مطالعے کی عادت اپنانے کے طریقے

1. روزانہ کم از کم تیس منٹ مطالعے کے لیے مخصوص کریں۔
2. مفید اور فکری کتابوں کا انتخاب کریں۔
3. مطالعے کے دوران نوٹس بنانے کی عادت ڈالیں۔
4. مطالعے پر غور و فکر کریں اور دوسروں سے گفت گو کے ذریعے خیالات کو نکھاریں۔

مطالعہ ایک مستقل عمل ہے جو شخصیت کو مسلسل بہتر بناتا ہے۔ جو لوگ اس عادت کو اپناتے ہیں، ان کی سوچ میں وسعت اور گفت گو میں شائستگی پیدا ہوتی ہے۔

3.2- مثبت طرزِ فکر

فرد کی شخصیت میں سب سے اہم عنصر اس کا طرزِ فکر (Mindset) ہے۔ انسان کا رویّہ اور سوچ کا زاویہ اس کی کام یابی اور ناکامی میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ مثبت طرزِ فکر انسان کو مشکلات میں امید، صبر اور حوصلہ عطا کرتا ہے۔

3.2.1- مثبت طرزِ فکر کے فوائد

1. خود اعتمادی میں اضافہ
2. مسائل کے بجائے حل پر توجہ
3. سماجی تعلقات میں بہتری
4. ذہنی سکون اور خوش حالی
5. کام یابی کے امکانات میں اضافہ

3.2.2- مثبت طرزِ فکر پیدا کرنے کے عملی طریقے

1. منفی خیالات کو مثبت رخ دینے کی عادت ڈالیں۔
2. ناکامی پر مایوس ہونے کے بجائے اس سے سبق حاصل کریں۔
3. اچھے اور حوصلہ افزا لوگوں کی صحبت اختیار کریں۔
4. اللہ کی نعمتوں پر شکر گزاری کا رویّہ اپنائیں۔
5. اپنی کام یابیوں کو یاد رکھیں اور خود کو حوصلہ دیں۔
6. گفت گو میں مثبت اور امید افزا الفاظ استعمال کریں۔

مثبت طرزِ فکر وہ جوہر ہے جو شخصیت اور طرزِ زندگی دونوں کو نکھار دیتا ہے۔

3.3-سماجی میل جول

انسان ایک سماجی مخلوق ہے، اور اس کی شخصیت کی تشکیل میں تعلقات اور گفت گو کا بنیادی کردار ہوتا ہے۔ مؤثر میل جول سے نہ صرف خود اعتمادی بڑھتی ہے بل کہ زندگی کے کئی دروازے کھلتے ہیں۔

3.3.1- سماجی میل جول کی اہمیت

1. خود اعتمادی اور گفت گو میں روانی
2. پیشہ ورانہ مواقع میں بہتری
3. نفسیاتی استحکام

4. قیادت کی صلاحیت میں اضافہ

3.3.2-سماجی مہارتیں بڑھانے کے طریقے

1. فعال سننے (Active Listening) کی عادت اپنائیں۔
2. گفت گو میں نرمی اور اعتماد رکھیں۔
3. مثبت جسمانی زبان اپنائیں۔
4. دوسروں کو عزت اور توجہ دیں۔
5. معاشرتی تقریبات میں شرکت کریں۔
6. دوسروں کی مدد کریں۔

سماجی میل جول شخصیت کے نکھار میں بنیادی کردار رکھتا ہے اور ایک متوازن معاشرتی فرد بننے کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔

3.4-تنقیدی سوچ اور فیصلہ سازی

زندگی میں کامیابی کا انحصار درست سوچ اور بروقت فیصلوں پر ہے۔ تنقیدی سوچ (Critical Thinking) اور مؤثر فیصلہ سازی (Decision Making) وہ اوصاف ہیں جو ایک مضبوط شخصیت کو دوسروں سے ممتاز کرتے ہیں۔

3.4.1- تنقیدی سوچ کی خصوصیات

1. معروضی تجزیہ
2. دلائل پر انحصار
3. نئے زاویوں سے غور و فکر
4. کھلے ذہن کا حامل ہونا
5. سیکھنے کی مستقل روش

3.4.2- تنقیدی سوچ پیدا کرنے کے طریقے

1. تحقیق کے بغیر کسی بات کو قبول نہ کریں۔
2. معلومات کے معتبر ذرائع تلاش کریں۔

3. مختلف زاویوں سے غور کریں۔
4. دوسروں کی آرا سنیں۔
5. اپنی رائے پر نظرِ ثانی کرتے رہیں۔

3.5- فیصلہ سازی کی مہارت

درست فیصلہ سازی کامیاب زندگی کی بنیاد ہے۔اچھے فیصلے ہمیشہ علم، تجربے،اور مشاورت کے امتزاج سے پیدا ہوتے ہیں۔

3.5.1- فیصلہ سازی کے بنیادی اصول

1. مکمل معلومات جمع کریں۔
2. متبادل راستے تلاش کریں۔
3. متوقع نتائج پر غور کریں۔
4. مشاورت اختیار کریں۔
5. تجربے کو اہمیت دیں۔
6. فیصلے پر ثابت قدم رہیں۔

تنقیدی سوچ اور فیصلہ سازی کا امتزاج ایسی شخصیت کو جنم دیتا ہے جو خود مضبوط ہوتی ہے اور دوسروں کی رہ نمائی کے قابل بن جاتی ہے۔

3.6- خود احتسابی(Self-Assessment)

خود احتسابی شخصیت کی تعمیر کا وہ پہلو ہے جو انسان کو اپنی اصلاح، کردار سازی اور باطنی توازن کی طرف لے جاتا ہے۔

3.6.1- خود احتسابی کی اہمیت

1. اصلاحِ ذات
2. کردار کی مضبوطی
3. بہتر فیصلہ سازی
4. وقت اور وسائل کا درست استعمال

5. روحانی ونفسیاتی ترقی

3.6.2- خوداحتسابی کے عملی طریقے

1. روزانہ کی کارکردگی کا جائزہ لیں۔
2. اپنی خامیوں اور خوبیوں کو لکھیں۔
3. خیر خواہوں سے رائے لیں۔
4. اپنے اعمال کو اخلاقی اصولوں پر پرکھیں۔
5. اپنے مقاصد کا وقتاً فوقتاً جائزہ لیں۔
6. غلطیوں پر ندامت اور سیکھنے کا جذبہ پیدا کریں۔

3.6.3-خوداحتسابی اور کام یابی

کام یاب افراد کی زندگی میں خوداحتسابی ایک نمایاں قدر کے طور پر نظر آتی ہے۔یہی رویّہ انسان کو اپنی اصلاح پر آمادہ کرتا اور معاشرے میں مثبت کردار ادا کرنے کے قابل بناتا ہے۔

4-خلاصہ(Summary)

اس یونٹ میں شخصیت کی تعمیر کے بنیادی اصولوں پر روشنی ڈالی گئی۔ابتدا میں شخصیت کے مفہوم کو واضح کیا گیا جس میں اس کے فطری اور اکتسابی پہلو بیان ہوئے۔اس کے بعد شخصیت کی اہمیت پر گفت گو کی گئی اور یہ بتایا گیا کہ ایک متوازن اور مثبت شخصیت کس طرح انسان کی کام یابی اور معاشرتی حیثیت پر اثرانداز ہوتی ہے۔

پھر شخصیت کی مختلف اقسام پر بحث کی گئی، جہاں درون گرا، برون گرا اور اعتدالی شخصیت کے حامل افراد کے مزاج اور رویّوں کے فرق کو واضح کیا گیا۔اس کے بعد شخصیت کی تعمیر میں اثرانداز ہونے والے عوامل جیسے موروثی اثرات، ماحولیاتی حالات، تعلیم وتربیت اور روحانی واخلاقی پہلوؤں کا مطالعہ کیا گیا۔

مزید برآں، شخصیت کی تعمیر کے عملی اقدامات پر تفصیل سے گفت گو کی گئی جن میں مطالعہ، مثبت طرزِ فکر، سماجی میل جول، تنقیدی سوچ، فیصلہ سازی اور خوداحتسابی جیسے پہلو شامل تھے۔یونٹ کے اختتام پر خوداحتسابی کی اہمیت پر زور دیا گیا، جو ہر فرد کی اصلاح اور ترقی کی راہ میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔

یہ یونٹ ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ شخصیت کی نشوونما ایک مسلسل عمل ہے جس کے لیے شعوری کوشش، سیکھنے کا جذبہ اور عملی اقدامات ضروری ہیں۔ اگر ہم اپنی شخصیت کی تعمیر پر توجہ دیں تو نہ صرف اپنی ذاتی و پیشہ ورانہ زندگی میں کامیاب ہو سکتے ہیں بل کہ معاشرے میں بھی ایک مثبت اور فعال کردار ادا کر سکتے ہیں۔

خود آزمائی (Self-Assessment)

1. شخصیت کی تعریف کریں اور اس کے بنیادی اجزا بیان کریں۔
2. مثبت شخصیت کی تعمیر میں تین اہم عوامل کون سے ہیں؟ وضاحت کریں۔
3. آپ اپنی شخصیت کو کس زمرے میں رکھتے ہیں—درون گرا، برون گرا یا اعتدالی؟ اپنی رائے کی تائید میں دلائل دیں۔
4. کامیابی اور شخصیت کے مابین کیا تعلق ہے؟ کوئی عملی مثال دے کر وضاحت کریں۔
5. آپ اپنی شخصیت میں بہتری لانے کے لیے کون سے تین عملی اقدامات اختیار کریں گے؟

یونٹ:2

تعمیر شخصیت کے اُصول

مصنف: ڈاکٹر محمود احمد

نظرِ ثانی: ڈاکٹر محمد افضل

فہرست عنوانات

1-تعمیرِ شخصیت کے بنیادی اصول 23

(Core Principles of Personality Development) 23

1.1-خود شناسی (Self-Awareness) 23

1.2-خود احتسابی اور شخصیت میں بہتری کا عمل 24

1.3- مقصدیت (Goal Orientation) 24

1.3.1-واضح مقصد اور نصب العین کا تعین 25

1.3.2-کام یابی کے لیے مختصر اور طویل مدتی اہداف 25

1.4-خود اعتمادی (Self-Confidence) 25

1.4.1-اعتماد کی تعمیر اور مضبوط شخصیت کی تشکیل 26

1.4.2-خوف اور عدمِ تحفظ پر قابو پانے کے طریقے 26

1.5-دیانت داری اور راست بازی (Honesty and Integrity) 27

1.6- تحمل و برداشت (Patience and Tolerance) 27

1.7-ایثار اور خدمتِ خلق (Selflessness and Public Service) 28

1.8-معاشرتی تعلقات (Social Relationships) 28

2۔ عملی اقدامات (Practical Steps) 29

2.1-تعمیرِ شخصیت کے اصولوں کو عملی زندگی میں برتنے کے طریقے 29

2.2-خود شناسی کی مشقیں 29

2.3- مقصدیت کی تشکیل 30
2.4-مثبت طرزِ فکر کی تربیت 30
2.5-خوداعتمادی کی آبیاری 30
2.6-اخلاقی اصولوں کی مشق 30
2.7-معاشرتی روابط کا استحکام 31
3۔ خلاصہ (Summary) 31
4۔خودآزمائی 32

یونٹ کا تعارف

انسانی شخصیت محض خیالات، جذبات اور عادات کا مجموعہ نہیں بل کہ ایک ایسی مربوط اکائی ہے جو اصولوں کی روشنی میں نشوونما پاتی ہے۔ تعمیرِ شخصیت کا عمل ایک مسلسل اور شعوری کوشش ہے جس میں فرد اپنی ذات کو بہتر بنانے، اپنے رویّوں کو متوازن کرنے، اور اپنے گرد و پیش کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرنے کی جدوجہد کرتا ہے۔ ہر انسان کے اندر بے شمار فطری صلاحیتیں اور امکانات پوشیدہ ہوتے ہیں، لیکن ان کی صحیح سمت میں رہ نمائی کے لیے چند بنیادی اصولوں کی ضرورت ہوتی ہے، جن سے نہ صرف انسان کی فکری و اخلاقی بلندی ممکن ہوتی ہے بل کہ اس کی عملی زندگی بھی استحکام حاصل کرتی ہے۔

تعمیرِ شخصیت کے ان اصولوں میں خود شناسی، مقصدیت، مثبت طرزِ فکر، اور خود اعتمادی جیسے پہلو فرد کی اندرونی مضبوطی کا ذریعہ بنتے ہیں جب کہ دیانت داری، تحمل و برداشت، ایثار، اور معاشرتی روابط کی مضبوطی جیسے اخلاقی و سماجی اصول اسے بیرونی دنیا میں وقار اور توازن عطا کرتے ہیں۔

یہ یونٹ انھی اصولوں کو واضح اور منظم انداز میں پیش کرتا ہے تاکہ طلبہ یہ سمجھ سکیں کہ شخصیت کی تعمیر میں فطری استعداد اور اکتسابی تربیت دونوں کا کیا کردار ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس میں ایسے عملی اقدامات بھی بیان کیے گئے ہیں جن کے ذریعے ایک انسان اپنے نظری علم کو روزمرہ زندگی کے عمل میں ڈھال سکتا ہے، اور یوں وہ نہ صرف اپنے کردار کو نکھارتا ہے بل کہ معاشرتی سطح پر بھی ایک مؤثر اور باوقار کردار ادا کر سکتا ہے۔

یونٹ کے مقاصد

امید ہے کہ اس یونٹ کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1. شخصیت کی تعمیر میں بنیادی اصولوں کی اہمیت اور ان کے اثرات کو سمجھ سکیں۔
2. خود شناسی اور خود احتسابی کے باہمی تعلق اور ان کے اصلاحی کردار کا ادراک حاصل کر سکیں۔
3. مثبت طرزِ فکر اور مقصدیت کو اپنانے کے عملی طریقوں سے واقف ہو سکیں۔
4. خود اعتمادی کی آبیاری اور خوف یا تذبذب پر قابو پانے کے مؤثر اصولوں کو سمجھ سکیں۔
5. دیانت داری، تحمل، ایثار اور معاشرتی تعلقات جیسے اخلاقی اقدار کے کردار کو بہتر طور پر پہچان سکیں۔
6. روزمرہ زندگی میں تعمیرِ شخصیت کے اصولوں کو شعوری طور پر برتنے کے قابل ہو سکیں۔

1-تعمیرِ شخصیت کے بنیادی اصول(Core Principles of Personality Development)

شخصیت کی تعمیر محض ظاہری آداب یا رسمی تربیت کا نام نہیں، بل کہ یہ انسان کے اندر موجود صلاحیتوں، رجحانات اور اقدار کو ایک متوازن نظام میں ڈھالنے کا عمل ہے۔ جس طرح ایک معمار اینٹوں کو ترتیب سے جوڑ کر عمارت کھڑی کرتا ہے، ویسے ہی شخصیت کے معمار—یعنی خود انسان—اپنے اندر کی قوتوں، جذبات، اور اخلاقی میلانات کو سنوار کر اپنی ذات کی عمارت مکمل کرتا ہے۔

تعمیرِ شخصیت کے بنیادی اصول وہ ستون ہیں جن پر ایک صالح، باشعور اور متوازن انسان کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ ان میں سب سے پہلا اصول **خود شناسی** ہے، جو فرد کو اپنی حقیقت، قوت، اور کمزوریوں سے آگاہ کرتا ہے۔

1.1-خود شناسی(Self-Awareness)

شخصیت کی تعمیر میں پہلا اور سب سے بنیادی قدم اپنے آپ کو پہچاننا ہے۔ اگر انسان اپنی صلاحیتوں، کمزوریوں، رجحانات، ترجیحات، جذبات اور رویّوں سے ناواقف ہو، تو وہ زندگی کے کسی بھی میدان میں پائیدار ترقی نہیں کر سکتا۔ گویا خود شناسی وہ آئینہ ہے جس میں فرد اپنی اصل صورت دیکھتا ہے اور اسی کی روشنی میں اپنی اصلاح اور ترقی کا سفر شروع کرتا ہے۔

انسان کے اندر ایک باطنی دنیا آباد ہے جس میں اس کی نیتیں، خواہشیں، محرّکات اور فیصلے جنم لیتے ہیں۔ اگر یہ دنیا اس پر مخفی ہو، تو ظاہر کی دنیا کبھی متوازن نہیں ہو سکتی۔ خود شناسی دراصل اس باطنی دنیا میں روشنی ڈالنے کا نام ہے۔ اس کے ذریعے انسان جان پاتا ہے کہ اس کی اصل قوت کہاں پوشیدہ ہے، اس کے رویّوں میں کون سی خامیاں مزاحم ہیں، اور اس کا مزاج کن رجحانات سے تشکیل پاتا ہے۔

ہر فرد کو اللہ تعالیٰ نے کچھ نہ کچھ صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ کوئی علم و فہم میں مہارت رکھتا ہے، تو کوئی تنظیم و قیادت کی خوبیوں کا حامل ہوتا ہے۔ کوئی گفت گو میں اثر رکھتا ہے، تو کوئی عمل میں استقامت رکھتا

ہے۔ خود شناسی کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ انسان اپنی ان صلاحیتوں کو پہچانے اور انھیں درست سمت میں استعمال کرے۔

اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ انسان اپنی کمزوریوں سے غافل نہ رہے۔ اکثر اوقات انسان دوسروں پر تنقید کرتے ہوئے خود پر تنقید برداشت نہیں کرتا، اور اپنی کمزوریوں سے آنکھیں چرا لیتا ہے۔ حالاں کہ تعمیرِ شخصیت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی غفلت ہے۔ جب تک انسان اپنی خامیوں کو دیکھنے اور تسلیم کرنے کی ہمت نہیں کرے گا، ان کی اصلاح بھی ممکن نہ ہو گی۔

1.2- خود احتسابی اور شخصیت میں بہتری کا عمل

خود شناسی کا منطقی نتیجہ خود احتسابی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ خود احتسابی کا مطلب یہ ہے کہ انسان روزانہ اپنی گفت گو، حرکات، فیصلوں اور رویّوں کا جائزہ لے—— کیا وہ ان اصولوں پر پورا اترا جنھیں وہ خود مانتا ہے؟ کہیں وہ قول و فعل میں تضاد کا شکار تو نہیں؟ کہیں وہ خود غرضی، غصے، حسد یا تکبر جیسے اخلاقی نقائص میں تو مبتلا نہیں؟

یہ احتساب اگر دیانت داری سے کیا جائے، تو انسان میں روز بروز نکھار آتا ہے۔ وہ نہ صرف اپنی کوتاہیوں پر قابو پاتا ہے بل کہ نیکی، سچائی، اور ایثار جیسے اوصاف کو اپنانے میں بھی کام یاب ہوتا ہے۔

خلاصہ : خود شناسی ایک مسلسل عمل ہے، جو انسان کو باطن کی روشنی عطا کرتا ہے اور شخصیت کو پائیدار بنیاد فراہم کرتا ہے۔ یہ وہ آغاز ہے جو کسی بھی بامقصد زندگی کا نقطۂ اوّل ہوتا ہے۔

1.3- مقصدیت (Goal Orientation)

زندگی اگر کسی واضح مقصد کے بغیر بسر کی جائے، تو وہ محض وقت گزاری بن کر رہ جاتی ہے۔ تعمیرِ شخصیت کی راہ میں دوسری اہم اینٹ مقصدیت ہے، یعنی زندگی کے لیے ایک بامعنی، بامقصد اور قابلِ حصول نصب العین کا تعین۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو محض کھانے، سونے اور دنیوی آسایشوں میں مصروف رہنے کے لیے پیدا نہیں کیا

بل کہ اسے ایک خاص منصب، ایک بڑی ذمہ داری، اور ایک معنویت سے وابستہ کر کے دنیا میں بھیجا ہے۔ چناں چہ ایک مسلمان کے لیے مقصدیت کا مطلب یہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنے وجود، صلاحیت، وقت اور محنت کو کسی اعلیٰ و ارفع نصب العین کے تابع کرے۔

1.3.1-واضح مقصد اور نصب العین کا تعین

زندگی کے مختلف مراحل میں انسان کو چھوٹے بڑے کئی اہداف درپیش ہوتے ہیں، لیکن ان سب کو کسی نہ کسی جامع مقصد کے تحت مربوط ہونا چاہیے۔ مثلاً ایک طالب علم کا ہدف یہ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی خاص میدان میں مہارت حاصل کرے، مگر اس کی غایت صرف معاشی استحکام نہ ہو، بل کہ وہ اپنی قابلیت کو سماج، امت اور انسانیت کی بھلائی کے لیے وقف کرنے کا جذبہ رکھتا ہو۔

1.3.2-کام یابی کے لیے مختصر اور طویل مدتی اہداف

حقیقی کام یابی کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنے طویل مدتی نصب العین کو مختصر مدتی اہداف میں تقسیم کرے۔ یوں ہر مرحلہ ایک منزل بن جاتا ہے، اور ہر منزل اگلے سفر کا پیش خیمہ۔ یہ اہداف جتنے واضح، قابل ناپ اور حقیقت پسندانہ ہوں، اتنی ہی شخصیت میں سنجیدگی، استقامت اور نظم پیدا ہوتا ہے۔

الغرض مقصدیت شخصیت کی وہ روح ہے جو اسے جمود سے نکال کر عمل، جدوجہد اور ارتقا کے راستے پر ڈالتی ہے۔ جو زندگی کسی مقصد کے تحت نہ گزرے، وہ خواہ کتنی ہی پر آسایش ہو، در حقیقت ایک خول کے سوا کچھ نہیں۔

1.4-خود اعتمادی(Self-Confidence)

انسان کی باطنی توانائیوں میں سب سے مؤثر اور تعمیری طاقت اگر کوئی ہے تو وہ خود اعتمادی ہے۔ یہ وہ روحانی اور ذہنی وقار ہے جو انسان کو اپنے فیصلوں پر یقین، اپنے عمل پر بھروسا، اور اپنے سفر میں استقلال عطا کرتا ہے۔ خود اعتمادی شخصیت کی وہ بنیاد ہے جو نہ صرف انسان کو گرنے سے بچاتی ہے بل کہ اسے بلند حوصلگی، قیادت، اور کام یابی کی طرف بھی لے جاتی ہے۔

1.4.1-اعتماد کی تعمیر اور مضبوط شخصیت کی تشکیل

خود اعتمادی فطری بھی ہو سکتی ہے اور اکتسابی بھی۔ کچھ افراد قدرتاً پُر اعتماد ہوتے ہیں، مگر بیشتر کو اسے سیکھنا اور پیدا کرنا پڑتا ہے۔ یہ اعتماد کسی جادوئی عمل سے نہیں آتا، بل کہ مطالعے، تجربے، مہارت، اور مسلسل سیکھنے سے پروان چڑھتا ہے۔

اعتماد کی تعمیر کے چند بنیادی عناصر درج ذیل ہیں:

1. اپنی صلاحیتوں کا درست اندازہ
2. ماضی کی کامیابیوں کو یاد رکھنا
3. چھوٹے اہداف کو پورا کر کے حوصلہ بڑھانا
4. تنقید سے گھبراہٹ کے بجائے اصلاح کی جستجو
5. مسلسل مشق اور جدوجہد کا رویہ

1.4.2-خوف اور عدمِ تحفظ پر قابو پانے کے طریقے

اکثر افراد میں خود اعتمادی کی کمی خوف، ناکامی کے تجربات، دوسروں کے طعنوں، یا بچپن کی تربیت سے جنم لیتی ہے۔ اس کمی پر قابو پانے کے لیے درج ذیل حکمتِ عملی اختیار کی جا سکتی ہے:

خوف کو پہچاننا اور اس کا سامنا کرنا

مثبت خود کلامی اپنانا ("میں ناکام نہیں، سیکھ رہا ہوں")

مثبت ماحول میں رہنا

صلاحیتوں کی آب یاری اور مہارت حاصل کرنا

یاد رہے کہ خود اعتمادی کا تعلق اس بات سے ہے کہ آپ خود کو کتنی عزت دیتے ہیں، اپنی آواز کو کتنے درجہ میں سنتے ہیں، اور اپنی ذات کو کیا مقام دیتے ہیں۔ جو خود پر اعتماد کرنا سیکھ جائے، دنیا اس پر بھروسا کرنے لگتی ہے۔

1.5-دیانت داری اور راست بازی(Honesty and Integrity)

شخصیت کی تعمیر دیانت داری اور راست بازی کے بغیر تصور ہی نہیں کی جاسکتی، کیوں کہ یہی وہ بنیادیں ہیں جن پر اخلاقی وقار، معاشرتی اعتماد اور روحانی بالیدگی قائم ہوتی ہے۔ دیانت محض مالی یا امانتی معاملات میں سچائی تک محدود نہیں رہتی، بل کہ وہ سوچ، نیت، گفت گو اور عمل کی مجموعی شفافیت کا نام ہے؛ اسی طرح راست بازی صرف ظاہری شرافت نہیں، بل کہ باطن کی صداقت، فیصلوں میں غیر جانب داری اور کردار میں استقلال کا تقاضا بھی کرتی ہے۔ دیانت دار انسان اپنے اندر وہ اعتماد پیدا کرتا ہے جو اسے معاشرتی دباؤ، ذاتی لالچ یا وقتی منفعت کے باوجود درست راستے پر قائم رکھتا ہے؛ اس کی گفت گو اور فیصلے خود اس کے کردار کے لیے ایسی شہادت بن جاتے ہیں جن کی بنا پر لوگ اس پر بھروسا کرتے ہیں۔ راست باز شخص اصولوں کا محض واعظ نہیں بنتا بل کہ ان اصولوں کا چلتا پھرتا نمونہ بن کر سامنے آتا ہے؛ وہ وہی کہتا ہے جو سوچتا ہے اور وہی کرتا ہے جو کہتا ہے۔ البتہ یہ راہ ہمیشہ ہموار نہیں ہوتی؛ متعدد مواقع پر سچائی قربانی، صبر اور تنہائی کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس کے باوجود دیرپا فائدہ اسی کے دامن سے وابستہ رہتا ہے اور وہی شخصیت حقیقی معنوں میں تعمیر یافتہ کہلاتی ہے جو سچائی کا بوجھ اٹھانے کا حوصلہ رکھتی ہو۔

1.6- تحمل و برداشت(Patience and Tolerance)

تعمیرِ شخصیت کے اخلاقی اصولوں میں تحمل اور برداشت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، کیوں کہ یہ دونوں صفات انسان کو داخلی طور پر مضبوط اور خارجی سطح پر مؤثر بناتی ہیں۔ تحمل سے مراد ناخوشگوار حالات میں ضبطِ نفس ہے اور برداشت کا مفہوم مخالف آرا، رویّوں اور تنقید کو وقار اور حوصلے سے قبول کرنا ہے۔ جو شخص ہر اشتعال انگیز بات کا ردِ عمل فوراً ظاہر کرتا ہے وہ اپنے آپ کو دوسروں کے ہاتھوں کھیل بنا دیتا ہے، جب کہ متانت، خاموشی اور تدبیر سے کام لینے والا فرد نہ صرف جذبات کی بے لگامی سے بچا رہتا ہے بل کہ دوسروں پر مثبت اثر بھی ڈالتا ہے۔ معاشرتی سطح پر اختلافِ رائے ناگزیر ہوتا ہے؛ اگر اس اختلاف کو لڑائی سمجھ لیا جائے اور ہر تنقید کو دشمنی جان لیا جائے تو تعلقات بکھرنے لگتے ہیں۔ برداشت کی روح یہ نہیں کہ غلطی کو درست مان لیا جائے، بل

کہ یہ ہے کہ ردِ عمل میں شائستگی اور حکمت اختیار کی جائے اور اصلاح کے دروازے کھلے رکھے جائیں۔ یہ اوصاف محض خداداد نہیں ہوتے؛ مسلسل ضبط، خود آگہی اور روزمرہ کی چھوٹی صورتِ حال میں صبر کی مشق بڑے فیصلوں کی استقامت بن جاتی ہے اور یوں داخلی پختگی شخصیت کے وقار میں ڈھلتی چلی جاتی ہے۔

1.7-ایثار اور خدمتِ خلق (Selflessness and Public Service)

شخصیت کی بلندی اس وقت پورے حسن کے ساتھ سامنے آتی ہے جب انسان اپنی ذات کی حدوں سے اوپر اٹھ کر دوسروں کے لیے جینے کا حوصلہ پیدا کرے۔ ایثار اسی بلند رویے کا نام ہے جس میں آدمی اپنی ضرورت کو پسِ پشت ڈال کر کسی دوسرے کی حاجت پوری کرنے کو ترجیح دیتا ہے، اور خدمتِ خلق اسی جذبے کا عملی مظہر ہے۔ ایثار خودی کی نفی نہیں بل کہ اس کی معراج ہے؛ انسان جب نام و نمود، بدلے کی توقع یا تحسین کی آرزو کے بغیر خاموشی اور خلوص سے عطا کرتا ہے تو دراصل اپنے اخلاقی قد کا اظہار کرتا ہے۔ خدمتِ خلق محض مالی اعانت تک محدود نہیں رہتی؛ کسی کی دل جوئی، اس کے لیے وقت نکالنا، مسئلے میں شریک ہونا یا حتیٰ کہ ایک تسلی آمیز کلمہ کہنا بھی اسی کے ذیل میں آتا ہے۔ جو معاشرے ایثار اور خدمت کے اس معیار کو اپنا لیتے ہیں وہاں افراد باوقار، ادارے مربوط اور سماج شفیق دکھائی دیتا ہے، اور یہی فضا قیادت کی کم از کم شرطیں پوری کرتی ہے، کیوں کہ حقیقی قیادت صرف فہم و فراست نہیں، دوسروں کی خاطر قربانی دینے کے حوصلے سے بھی عبارت ہے۔

1.8-معاشرتی تعلقات (Social Relationships)

انسان فطرتاً سماجی وجود ہے؛ وہ نہ اکیلا جی سکتا ہے، نہ اکیلا سیکھ سکتا ہے اور نہ ہی اکیلا پنپ سکتا ہے، اسی لیے معاشرتی تعلقات شخصیت کی نشوونما میں فیصلہ کن کردار ادا کرتے ہیں۔ گھر، محلہ، مدرسہ، دفتر، بازار اور ابلاغِ عامہ کے نئے ذرائع—ان سب دائروں میں ایسے روابط مطلوب ہیں جن کی بنیاد احترام، خیر خواہی، رواداری، اعتماد اور حسنِ ظن پر استوار ہو۔ محض بول دینا کافی نہیں ہوتا؛ سننا اور سمجھنا بھی فن ہے۔ جو شخص دوسروں کے زاویۂ نظر کو توجہ سے سنتا اور ان کے دکھ درد کو محسوس کرتا ہے وہ دلوں میں جگہ بناتا ہے اور یہی اہلیت مؤثر گفت

گواور ہم دردانہ سماعت کے ذریعے تعلقات کو استواری بخشتی ہے۔ اختلافِ رائے جب پیدا ہو تو بالغ نظری کا تقاضا یہ ہے کہ اسے حکمت، سکون اور تدبیر سے سلجھایا جائے؛ ہر تنقید کو شخصی حملہ سمجھنے یا ہر اختلاف کو معرکۂ حق و باطل بنا دینے سے تعلقات میں بگاڑ آتا ہے۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ ہر رشتے کی حدود پہچانی جائیں؛ نہ بے جا مداخلت ہو نہ غیر ضروری دوری، بل کہ ایسا توازن قائم رہے جو اعتماد پیدا کرے، فاصلے کم کرے اور شخصیت کو تہذیب و قرینے کا پتا دے۔

2۔ عملی اقدامات(Practical Steps)

2.1- تعمیرِ شخصیت کے اصولوں کو عملی زندگی میں برتنے کے طریقے

تعمیرِ شخصیت کے اصول محض نظری مباحث نہیں، بل کہ وہ رہنما خطوط ہیں جنہیں زندگی کے ہر موڑ پر برتا جا سکتا ہے۔ اگر ان اصولوں کو صرف کتابی الفاظ کے طور پر سمجھ لیا جائے تو ان کا اثر سطحی رہتا ہے، مگر جب انسان اپنی روزمرہ زندگی میں انھیں شعوری طور پر اپناتا ہے تو یہی اصول اس کے کردار کو نکھارتے اور اس کی ذات کو سنوارتے ہیں۔ ان کی اصل روح یہ ہے کہ وہ انسان کے رویّوں، فیصلوں اور تعلقات میں مثبت تبدیلی پیدا کریں۔ ذیل میں چند ایسے عملی اقدامات بیان کیے گئے ہیں جو فرد کو ان اصولوں کو زندگی کے معمولات میں ڈھالنے میں مدد دیتے ہیں۔

2.2-خود شناسی کی مشقیں

خود شناسی کے لیے ضروری ہے کہ انسان روزانہ اپنی زندگی پر غور کرے۔ ہر رات چند لمحے یہ سوال خود سے کرے کہ آج میں نے کیا سیکھا؟ اپنی کمزوریوں اور خوبیوں کو تحریر کرے اور ان پر سنجیدگی سے غور کرے۔ ہفتہ وار بنیاد پر اپنے اہداف کا جائزہ لے کہ وہ اپنے مقاصد کے قریب جا رہا ہے یا ان سے دور۔ اس مسلسل خود احتسابی سے انسان اپنے باطن کے رخ کو پہچانتا اور اپنی اصلاح کی سمت متعین کرتا ہے۔

2.3- مقصدیت کی تشکیل

مقصد کے بغیر زندگی بے سمت رہتی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ انسان اپنے لیے واضح اہداف متعین کرے—ذاتی، پیشہ ورانہ اور اخلاقی۔ ہر ہدف کے لیے ایک مخصوص مدت مقرر کرے اور اسے چھوٹے قابلِ حصول مراحل میں تقسیم کرے۔ کامیابی کو محض مالی حیثیت یا شہرت سے نہ ناپے، بل کہ یہ دیکھے کہ وہ اپنے اصل مقصد سے کتنی قربت حاصل کر رہا ہے۔ یہی سوچ اسے جمود سے نکال کر ارتقا کی راہ پر گامزن کرتی ہے۔

2.4-مثبت طرزِ فکر کی تربیت

زندگی میں ہر مشکل کے ساتھ کوئی موقع بھی پوشیدہ ہوتا ہے۔ مثبت طرزِ فکر اسی موقع کو دیکھنے کا نام ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ انسان شکوہ کم کرے اور شکر زیادہ۔ کسی منفی بات پر فوری ردِ عمل دینے کے بجائے خاموشی اور توقف کو ترجیح دے، تاکہ سوچنے اور درست فیصلہ کرنے کی گنجایش باقی رہے۔ یہ طرزِ فکر انسان کو مایوسی سے نکال کر پُرامیدی، توازن اور دانش کی سمت لے جاتا ہے۔

2.5-خوداعتمادی کی آبیاری

خوداعتمادی کی تعمیر کے لیے ضروری ہے کہ انسان چھوٹے چھوٹے معاملات میں خود فیصلہ کرنے کی عادت ڈالے۔ اپنی گزشتہ کامیابیوں کو یاد رکھے اور ان سے حوصلہ حاصل کرے۔ دوسروں سے موازنہ کرنے کے بجائے اپنے معیار خود متعین کرے۔ یہ رویہ فرد کو نفسیاتی طور پر مضبوط بناتا ہے اور اس کے اندر یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ وہ اپنی تقدیر کا معمار خود ہے۔

2.6-اخلاقی اصولوں کی مشق

اخلاقی تربیت کے بغیر شخصیت کی عمارت کم زور رہتی ہے۔ اس لیے روزانہ کم از کم ایک نیکی کا ارادہ کرنا مفید ہے—چاہے کسی کا کام آسان کرنا ہو، کسی کے دل کو خوش کرنا ہو یا کسی کی مدد کرنا۔ سچ بولنے کی ہمت پیدا کی جائے، خواہ وقتی نقصان ہی کیوں نہ ہو، اور اختلاف کے موقع پر تحمل و ضبط سے کام لیا جائے۔ غصے پر قابو پانے کی مشق انسان کے اخلاقی استحکام میں اضافہ کرتی ہے۔

2.7-معاشرتی روابط کا استحکام

ایک متوازن شخصیت کے لیے مضبوط معاشرتی تعلقات ناگزیر ہیں۔ ہر روز کوشش کی جائے کہ کسی عزیز یا دوست کو وقت دیا جائے، چاہے ایک مختصر پیغام ہی کیوں نہ ہو۔ گفت گو میں ہمیشہ دوسروں کی بات پہلے سننے کا اصول اپنایا جائے اور اختلافِ رائے کو دشمنی میں بدلنے سے گریز کیا جائے۔ معافی مانگنے یا دینے کو کم زوری نہ سمجھا جائے بل کہ اسے انسانی عظمت کی علامت مانا جائے۔ جو شخص اپنے تعلقات میں اخلاص، رواداری اور توازن برقرار رکھتا ہے، وہ سماجی سطح پر بھی اعتماد اور محبت کے ماحول کو فروغ دیتا ہے۔

3۔ خلاصہ (Summary)

زیر نظر یونٹ میں ہم نے تعمیرِ شخصیت کے ان اصولوں کا مطالعہ کیا جو انسان کی داخلی اور خارجی زندگی کو متوازن، مؤثر اور بامقصد بناتے ہیں۔ آغاز میں یہ سمجھنے کی کوشش کی گئی کہ شخصیت کی تعمیر محض فکری عمل نہیں بل کہ ایک مسلسل تربیتی سفر ہے، جو خود شناسی، مقصدیت، دیانت، ایثار، تحمل، اور معاشرتی توازن جیسے اخلاقی و روحانی اصولوں پر استوار ہوتا ہے۔ ان اصولوں نے ہمیں یہ سکھایا کہ انسان جب اپنے باطن کو روشنی اور اپنے عمل کو سچائی کے تابع کرتا ہے تو اس کی شخصیت وقار، بصیرت اور استقامت کا مظہر بن جاتی ہے۔ آخر میں ہم نے ان اصولوں کو عملی زندگی میں برتنے کے مخصوص طریقوں کا جائزہ لیا تاکہ یہ افکار محض نظریات نہ رہیں بل کہ کردار کا حصہ بن سکیں۔ یوں یہ یونٹ قاری کو نہ صرف ایک بہتر انسان بننے کی ترغیب دیتا ہے بل کہ اسے وہ فکری، اخلاقی اور عملی سرمایہ بھی فراہم کرتا ہے جو ایک صالح، باوقار اور متوازن شخصیت کی تعمیر کے لیے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

4۔خود آزمائی

1. تعمیرِ شخصیت کے عمل میں اصولوں کی پابندی کیوں بنیادی اہمیت رکھتی ہے،اور یہ فرد کے کردار کی تشکیل میں کس طرح رہ نماثابت ہوتی ہے؟
2. خود شناسی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالیے اور وضاحت کیجیے کہ یہ عمل انسان کی باطنی اصلاح اور بیرونی توازن میں کس طرح مدد دیتا ہے؟
3. مثبت طرزِ فکر اختیار کرنے سے انسان کے رویّے، فیصلوں اور تعلقات پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟اپنی رائے دلائل کے ساتھ تحریر کیجیے۔
4. یونٹ میں بیان کردہ خود اعتمادی کی آبیاری کے عملی طریقوں کا خلاصہ پیش کیجیے اور وضاحت کیجیے کہ ان سے فرد کی شخصیت میں استحکام کیسے پیدا ہوتا ہے؟
5. دیانت داری اور تحمل و برداشت کو فرد کی سماجی زندگی میں کلیدی اوصاف کیوں قرار دیا گیا ہے؟مثالوں کے ذریعے واضح کیجیے کہ یہ دونوں خصوصیات معاشرتی ہم آہنگی پر کیسے اثرانداز ہوتی ہیں؟
6. تعمیرِ شخصیت کے اصولوں کو روزمرہ زندگی میں نافذ کرنے کے لیے ایک باشعور طالبِ علم کو کن عملی اقدامات پر عمل کرنا چاہیے؟

یونٹ:3

سماجی اخلاقیات

مصنف: ڈاکٹر منشاطیب

نظرِ ثانی: ڈاکٹر محمد افضل

فہرست عنوانات

یونٹ:3 33

سماجی اخلاقیات 33

مصنف:ڈاکٹر منشاطیب 33

نظرِثانی:ڈاکٹر محمد افضل 33

یونٹ کا تعارف 36

یونٹ کے مقاصد 36

1-سماجی اخلاقیات: تعارف و مفہوم 38

2-سماجی اخلاقیات کی دینی و فلسفیانہ اساس 39

2.1-دینی اساس 39

2.1.1-قرآنِ مجید میں سماجی اخلاقیات 40

2.1.2-احادیث اور سیرتِ نبویؐ کی روشنی میں اخلاقی اصول 40

2.2–فلسفیانہ اساس 41

– 2.2.1قدیم فلاسفہ اور سماجی اخلاقیات 41

2.2.2–جدید فلاسفہ اور سماجی اخلاقیات 42

3-سماجی اخلاقیات کے معاصر پہلو 44

– 3.1اخلاقی نسبیت(Moral Relativism) 44

3.2۔انفرادی آزادی بمقابلہ اجتماعی خیر 44

3.3۔ تکنیکی ترقی اور اخلاقی بحران 45
4-سماجی اخلاقیات کی عملی اہمیت 45
4.1–انفرادی سطح پر اخلاقی عمل کی اہمیت 46
4.2–معاشرتی سطح پر اخلاقیات کا اثر 46
4.3–قومی و بین الاقوامی سطح پر اثرات 47
5-خلاصہ 47
خود آزمائی 48

یونٹ کا تعارف

انسان بنیادی طور پر ایک سماجی مخلوق ہے، اور اس کی بقا، ترقی اور اطمینان کا دار و مدار ان اخلاقی اصولوں پر ہے جو اسے دوسروں کے ساتھ تعلقات میں اعتدال اور توازن سکھاتے ہیں۔ جب یہ اصول کمزور ہو جاتے ہیں تو معاشرتی زندگی میں خود غرضی، بے اعتمادی اور انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔

سماجی اخلاقیات ان ہی اصولوں کا مطالعہ ہے جو انسانی تعلقات کو منظم رکھتے ہیں اور اجتماعی ہم آہنگی کو ممکن بناتے ہیں۔ یہ اخلاقیات فرد اور معاشرے کے درمیان ایک ایسا رشتہ قائم کرتی ہیں جس سے سماجی نظم و استحکام پیدا ہوتا ہے۔

اس یونٹ میں ہم سماجی اخلاقیات کے مفہوم، اس کی دینی اور فلسفیانہ اساس، اور جدید انسانی معاشرے میں پیدا ہونے والے اخلاقی سوالات کا جائزہ لیں گے۔ ساتھ ہی یہ بھی دیکھا جائے گا کہ سماجی اخلاقیات کی عملی اہمیت کیا ہے اور وہ کس طرح فرد، معاشرے اور عالمی سطح پر کردار سازی میں مدد دیتی ہیں۔

یہ مطالعہ طلبہ کو اس بصیرت تک پہنچنے میں مدد دے گا کہ اخلاق صرف فرد کی ذاتی خوبی نہیں، بل کہ ایک ایسا سماجی جوہر ہے جو تمدن، قانون اور انسانی قدروں کی اساس بنتا ہے۔

یونٹ کے مقاصد

امید ہے کہ اس یونٹ کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1. سماجی اخلاقیات کے مفہوم اور دائرۂ کار کو وضاحت کے ساتھ بیان کر سکیں، اور اسے فردی اخلاقیات سے الگ پہچان سکیں۔
2. اخلاقیات کی دینی اور فلسفیانہ اساس کو ضمنی و تائیدی تناظر میں سمجھ سکیں، اور ان کے باہمی ربط کا تجزیہ کر سکیں۔
3. قدیم و جدید فلاسفہ کے افکار (افلاطون، ارسطو، کانٹ، جان اسٹورٹ مل، نطشے وغیرہ) کو سماجی اخلاقیات کے نظری مباحث سے جوڑ سکیں۔

4. جدید انسانی معاشرے میں پیدا ہونے والے اخلاقی سوالات جیسے اخلاقی نسبیت، انفرادی آزادی اور تکنیکی ترقی کے اثرات کا تجزیہ کر سکیں۔
5. سماجی اخلاقیات کی عملی اہمیت کو انفرادی، معاشرتی اور عالمی سطح پر مثالوں کے ساتھ واضح کر سکیں۔
6. اس نتیجے پر پہنچ سکیں کہ سماجی اخلاقیات محض ایک نظری علم نہیں بل کہ انسانی تمدن کے بقا اور استحکام کے لیے ایک عملی ضرورت ہے۔

1-سماجی اخلاقیات: تعارف و مفہوم

انسانی زندگی محض انفرادی وجود کا نام نہیں بل کہ ایک اجتماعی اور باہمی رشتوں سے بنی ہوئی حقیقت ہے۔ جب یہ رشتے اخلاقی اصولوں پر قائم ہوں تو معاشرہ عدل و توازن کا مظہر بنتا ہے۔ سماجی اخلاقیات وہ بنیاد ہے جو انسان کو محض فرد نہیں رہنے دیتی بل کہ اسے باشعور شہری اور اجتماعی ہستی بناتی ہے۔

اخلاقیات کا تعلق انسانی سیرت و کردار سے ہے اور یہی وہ جوہر ہے جو کسی فرد یا قوم کے عروج و زوال کا بنیادی سبب بنتا ہے۔ سماجی اخلاقیات سے مراد وہ اصول اور ضوابط ہیں جو افراد کے باہمی تعلقات میں رہ نمائی فراہم کرتے ہیں۔ ان اصولوں کی بنیاد عدل، دیانت، صداقت، رواداری اور باہمی ہمدردی جیسے اعلیٰ اوصاف پر ہوتی ہے۔ جب کسی معاشرے میں یہ اقدار مضبوط ہوں تو وہاں امن، انصاف اور خوش حالی فروغ پاتی ہے اور جب یہ اقدار کم زور پڑ جائیں تو انتشار، بد دیانتی اور بد عنوانی جیسے مسائل جنم لیتے ہیں۔

فلاسفہ اور علما نے سماجی اخلاقیات کو مختلف انداز میں بیان کیا ہے۔ ابنِ مسکویہ کے مطابق **خُلق** انسان کے اندر پیدا ہونے والی ایک ایسی کیفیت ہے جو اسے بغیر زیادہ سوچ بچار کے اچھے یا بُرے کاموں پر آمادہ کرتی ہے۔

امام غزالی نے اس تصور کو مزید واضح کرتے ہوئے کہا کہ خُلق دراصل انسان کی باطنی عادت یا طبیعت ہے جو کسی بناوٹی کوشش یا طویل غور و فکر کے بغیر خود بہ خود اور آسانی کے ساتھ اعمال کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

ارسطو کے نزدیک اخلاقیات کا مقصد انسانی کردار کو اعتدال اور توازن پر قائم رکھنا ہے تاکہ فرد اور معاشرہ دونوں اپنی فطری ہم آہنگی برقرار رکھ سکیں۔

جان اسٹورٹ مل نے اخلاقیات کی بنیاد "نفع رسانی" کے اصول پر رکھی۔ اس کے نزدیک وہی عمل درست ہے جو زیادہ سے زیادہ انسانوں کی خوشی کا باعث بنے؛ مل لکھتا ہے:

Actions are right in proportion as they tend to promote happiness; wrong as they tend to produce the reverse of happiness.

(Utilitarianism, 1863, Chapter II)

یعنی اخلاقیات وہ معیار ہے جو انسانی اعمال کو اس اعتبار سے پرکھتا ہے کہ وہ دوسروں کے لیے کتنے نفع بخش اور معاشرتی ہم آہنگی کے لیے کس قدر مددگار ہیں۔

انسان فطری طور پر ایک سماجی مخلوق ہے اور اس کی فلاح اسی میں مضمر ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ خیر خواہی اور انصاف کا برتاؤ کرے۔ ہر معاشرہ اپنے اجتماعی تجربات اور دینی و تہذیبی اقدار کی بنیاد پر کچھ اصول مرتب کرتا ہے جو اس کے افراد کے رویّوں کو متعین کرتے ہیں۔ یہی اصول جب اجتماعی سطح پر تسلیم کر لیے جائیں تو سماجی اخلاقیات کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ یہ محض نظریہ نہیں بل کہ انسانی تمدّن کی بقا کے لیے عملی ضرورت ہیں۔ سماجی اخلاقیات کا دائرہ فرد کے ذاتی رویّے سے لے کر ریاستی نظم و نسق تک ہر سطح پر اثرانداز ہوتا ہے۔ اچھا شہری وہ ہے جو اپنے حقوق و فرائض کا شعور رکھتا ہو، دوسروں کے حقوق کی پاس داری کرے، اور معاشرتی بھلائی کو ذاتی منفعت پر ترجیح دے۔ اسی لیے بڑے مفکرین اور ادیان نے سماجی اخلاقیات پر غیر معمولی زور دیا ہے کیوں کہ ان کے بغیر حقیقی ترقی ممکن نہیں۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر آگے چل کر ہم سماجی اخلاقیات کی سماجی حیثیت اور اس کی دینی و فلسفیانہ اساس پر تفصیلی گفت گو کریں گے۔

2- سماجی اخلاقیات کی دینی و فلسفیانہ اساس

سماجی اخلاقیات کی جڑیں انسان کے فطری شعور کے ساتھ ساتھ دینی تعلیمات اور فکری نظریات میں بھی پیوست ہیں۔ ہر دور میں مذاہب اور فلسفوں نے انسانی کردار کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سماجی اخلاقیات کی اساس نہ صرف وحیِ الٰہی پر قائم ہے بل کہ انسانی عقل و وجدان نے بھی اس کی توجیہ اور توضیح کی کوشش کی ہے۔

2.1- دینی اساس

سماجی اخلاقیات کی جڑیں تمام الہامی مذاہب میں موجود ہیں، لیکن اسلام نے اسے ایک مکمل ضابطۂ حیات کے طور پر پیش کیا ہے۔ اسلامی تعلیمات میں عدل، دیانت، رواداری اور ایثار جیسے اصولوں کو بنیادی حیثیت حاصل ہے کیوں کہ ان کے بغیر کسی بھی معاشرے میں حقیقی فلاح ممکن نہیں۔

قرآن وسنت میں بارہااس امر پر زور دیا گیاہے کہ مسلمان کا کردار صرف انفرادی زندگی تک محدود نہیں رہناچاہیے بل کہ اس کے سماجی تعلقات میں بھی اخلاقی اصولوں کا پرتو نمایاں ہوناچاہیے۔

2.1.1-قرآنِ مجید میں سماجی اخلاقیات

قرآنِ مجید نے سماجی زندگی کے لیے جو اخلاقی اصول بیان کیے ہیں وہ کسی مخصوص قوم یا گروہ کے لیے نہیں، بل کہ پوری انسانیت کے لیے راہ نماہیں۔ قرآن حکیم عدل، احسان، باہمی ہمدردی اور امانت داری کی تعلیم دیتاہے:

إِنَّ اللهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ(النحل 16:90)

ترجمہ: بے شک اللہ عدل، احسان اور قرابت داروں کو دینے کا حکم دیتاہے اور بے حیائی، برائی اور سرکشی سے روکتاہے۔

یہ آیت سماجی اخلاقیات کی جامع بنیاد فراہم کرتی ہے جس میں وہ تمام اقدار شامل ہیں جو ایک صالح اور متوازن معاشرے کے قیام کے لیے ضروری ہیں۔

اسی طرح قرآن نے جھوٹ، دھوکہ دہی، غیبت اور بددیانتی سے بھی منع فرمایاہے:

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ(البقرہ 2:188)

ترجمہ: اور اپنے اموال آپس میں ناحق نہ کھاؤ۔

2.1.2-احادیث اور سیرتِ نبویؐ کی روشنی میں اخلاقی اصول

رسول اکرم ﷺ کی سیرت سماجی اخلاقیات کا کامل نمونہ ہے۔ آپ ﷺ نے اپنے قول و عمل سے عدل وانصاف، ایثار، حسنِ سلوک اور دیانت داری کی اعلیٰ مثالیں قائم کیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ(مسند احمد، حدیث: 8952)

ترجمہ: مجھے اخلاق کی بلندیوں کو مکمل کرنے کے لیے بھیجا گیاہے۔

ایک اور حدیث میں فرمایا:

لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى يُحِبَّ لِأَخِيهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ(صحیح بخاری، حدیث: 13)

ترجمہ: تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

سیرتِ طیبہ میں ہمیں بے شمار عملی مثالیں ملتی ہیں، مثلاً:

- **فتحِ مکہ کے موقع پر عام معافی** : آپ ﷺ نے اپنے سخت ترین مخالفین کو بھی معاف فرما دیا۔
- **میثاقِ مدینہ کا قیام** : آپ ﷺ نے مدینہ کے یہودیوں اور غیر مسلموں کے ساتھ عدل و انصاف کا مثالی معاہدہ کیا جو مذہبی رواداری اور اجتماعی انصاف کی بہترین مثال ہے۔

2.2–فلسفیانہ اساس

انسانی اخلاق صرف مذہبی ہدایت کا مرہونِ منت نہیں بل کہ عقلِ انسانی بھی خیر و شر کے تعین میں ایک بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ تاریخِ فکرِ انسانی اس بات کی گواہ ہے کہ جب جب انسان نے اپنی عقل و وجدان کے سہارے اخلاق کے مسئلے پر غور کیا ہے تو آخرکار وہ انہی اصولوں تک پہنچا ہے جو وحی نے بطورِ الٰہی صداقت پیش کیے۔ اس لحاظ سے مذہب اور فلسفہ ایک دوسرے کے مخالف نہیں، بل کہ دونوں انسانی کردار کی تہذیب اور سماجی زندگی کے توازن کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ سماجی اخلاقیات کی فلسفیانہ اساس دراصل اسی فکری تلاش کی علامت ہے جس نے انسان کو صدیوں سے یہ سوال سوچنے پر مجبور کیا کہ اچھا عمل کیا ہے، اور ایک منصف و متوازن معاشرہ کن بنیادوں پر قائم ہوتا ہے۔

2.2.1–قدیم فلاسفہ اور سماجی اخلاقیات

قدیم یونان کی فکری روایت میں اخلاقیات کو پہلی مرتبہ منظم طور پر زیرِ بحث لایا گیا۔ **افلاطون** نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف The Republic میں اس خیال کو اجاگر کیا کہ ایک مثالی معاشرہ وہی ہو سکتا ہے جس کی بنیاد عدل پر ہو۔ اس کے نزدیک عدل کوئی خارجی ضابطہ نہیں بل کہ روح کی داخلی ہم آہنگی کا نتیجہ ہے۔ اس نے انسانی روح کے تین اجزا، عقل، جذبہ، اور خواہش کو متوازن رکھنے کو انفرادی نیکی کی شرط قرار دیا اور اسی اصول کو ریاست پر منطبق کر کے بتایا کہ اگر حکمران عقل مند ہوں، محافظ بہادر ہوں اور عوام اپنی حدود میں منظم رہیں تو

ریاست عدل وامن کی تصویر بن سکتی ہے۔

یوں افلاطون نے اخلاقی توازن کو سماجی نظم کی بنیاد بنا کر **سماجی اخلاقیات** کا پہلا نظری ماڈل پیش کیا، جس میں فرد اور ریاست دونوں کی فلاح ایک ہی اخلاقی اصول سے وابستہ ہے۔

افلاطون کے بعد اس کے شاگرد **ارسطو** نے اپنی کتاب Nicomachean Ethics میں اخلاقیات کو محض نظری قیاسات کے بجائے ایک عملی علم کے طور پر پیش کیا۔ اس نے کہا کہ ہر عمل کا ایک مقصد ہوتا ہے، اور سب سے اعلیٰ مقصد سعادت (Eudaimonia) ہے، جو فضیلت (Virtue) کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ فضیلت کے لیے وہ "اعتدال کی راہ (Golden Mean)" کا اصول دیتا ہے—یعنی ہر نیکی دو انتہاؤں کے درمیان توازن کا نام ہے: شجاعت بزدلی اور بے احتیاطی کے درمیان، سخاوت بخل اور اسراف کے درمیان۔ ارسطو کے نزدیک انسان "معاشرتی مخلوق" ہے، اور اس کی حقیقی خوشی ان ہی اوصاف میں ہے جو دوسروں کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کریں۔

ارسطو نے اخلاق کو صرف فرد کی اصلاح نہیں بل کہ معاشرتی توازن کی ضامن قوت قرار دیا۔ اس کے نزدیک وہی معاشرہ کام یاب ہے جس کے افراد اپنی ذاتی خواہشوں کو اجتماعی عدل کے تابع کر دیں۔

قدیم یونانی فکر کا یہی پیغام بعد کی تمام اخلاقی روایتوں کی بنیاد بنا کہ انسان اپنی فطرت میں سماجی ہے اور اس کی نیکی اس وقت تک کامل نہیں ہو سکتی جب تک وہ دوسروں کے حقوق اور معاشرتی بھلائی کو اپنے ذاتی مفاد پر مقدم نہ رکھے۔

2.2.2—جدید فلاسفہ اور سماجی اخلاقیات

زمانۂ جدید میں فلسفیانہ فکر نے مذہبی روایت سے ہٹ کر اخلاقی اصولوں کو عقل، تجربے اور انسانی آزادی کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی۔ اگرچہ اس دور میں وحی پر انحصار کم ہوا، مگر انسان کے ضمیر اور عقلِ عامہ نے وہی سوالات پھر اٹھائے عدل کیا ہے؟ خیر کا معیار کیا ہے؟ اور انسان اپنی اجتماعی زندگی کو کن اصولوں پر منظم کرے؟

اس دور میں **عمانوئل کانٹ** نے اخلاقیات کو عقلِ محض کی بنیاد پر استوار کیا۔ اس نے کہا کہ نیکی کا معیار عمل کے نتائج نہیں بل کہ اس نیت میں ہے جس کے ساتھ عمل کیا گیا ہو۔ اس نے Groundwork for

the Metaphysics of Morals میں یہ اصول پیش کیا:

"Act only according to that maxim whereby you can at the same time will that it should become a universal law."

ترجمہ: ''ایسا عمل اختیار کرو جس کا اصول ایسا ہو کہ تم چاہ سکو کہ وہ ایک عالم گیر قانون بن جائے۔''

کانٹ کے نزدیک انسان کا ہر عمل اس وقت اخلاقی کہلا سکتا ہے جب وہ ذاتی فائدے یا جذباتی جھکاؤ سے پاک ہو اور اسے اس نیت سے کیا جائے کہ یہی اصول سب کے لیے عدل کا معیار بنے۔ یوں کانٹ نے اخلاق کو **عالم گیر انسانی ذمہ داری** سے جوڑ دیا، جو سماجی اخلاقیات کی بنیادوں میں سے ایک ہے۔

جان اسٹورٹ مل نے اپنی کتاب Utilitarianism (1863) میں اخلاق کو نتائج کے معیار پر پرکھا ہے۔ اس نے کہا کہ وہی عمل نیک ہے جو زیادہ سے زیادہ انسانوں کی خوشی اور فلاح کا باعث بنے۔ اس نے اسے ''اعلیٰ مسرت کا اصول (Greatest Happiness Principle)'' کہا۔ اس نظریے کے تحت اجتماعی خوشی، مساوات، اور بھلائی کو اخلاقی معیار قرار دیا گیا۔ یہ تصور آج کی سماجی پالیسیوں، فلاحی ریاستوں اور انسانی حقوق کے نظام میں براہِ راست جھلکتا ہے۔

یوں مل کا نظریہ اخلاقیات کو عملی اور اجتماعی رنگ دیتا ہے—وہ انسان کے نفع کو نہیں بل کہ نوعِ انسانی کے مفاد کو مرکزی قدر بنا دیتا ہے۔

اس کے برعکس **فریڈرک نطشے** نے اخلاقیات کی روایتی تعبیرات پر تنقید کی۔ اپنی تصنیف Thus Spoke Zarathustra میں اس نے کہا کہ روایتی اخلاقی نظام کم زور اور غلام ذہنیت کے لوگوں نے بنائے ہیں، جو انسان کی تخلیقی قوت اور خودی کو دبا دیتے ہیں۔ وہ ''فوق البشر (Übermensch)'' کا تصور پیش کرتا ہے—ایسا انسان جو اپنی اقدار خود تخلیق کرتا ہے اور پرانی پابندیوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اگرچہ نطشے کا یہ تصور اجتماعی اخلاق سے متصادم دکھائی دیتا ہے، مگر اس کی اصل غرض یہ تھی کہ انسان اپنی شخصیت میں اتنی قوت پیدا کرے کہ وہ سماج میں اخلاقی اقدار کو کم زوری کے بجائے قوت، تخلیق اور خود اعتمادی کی بنیاد پر استوار کرے۔

نطشے کا انکار بھی در حقیقت سماجی اخلاقیات کے اس پہلو کو اجاگر کرتا ہے کہ اگر معاشرہ کم زور اخلاقی روایتوں کا شکار ہو جائے تو اسے انفرادی حوصلے اور فکری آزادی کی ضرورت ہوتی ہے۔

قدیم اور جدید دونوں فکری ادوار کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ انسان کی اجتماعی زندگی عدل، توازن اور نیکی جیسے اصولوں کے بغیر باقی نہیں رہ سکتی۔ اگر افلاطون اور ارسطو نے سماجی ہم آہنگی کے لیے اخلاقی توازن کو لازم قرار دیا، تو کانٹ اور مل نے عقل و نفعِ عامہ کی بنیاد پر اسے از سرِ نو سمجھایا، اور نطشے نے اس کی داخلی قوت کو جگانے کی دعوت دی۔

یوں فلسفہ اور دین دونوں اس نکتے پر متحد نظر آتے ہیں کہ ایک صالح معاشرہ صرف اسی وقت قائم ہو سکتا ہے جب انسان کی عقل، ارادہ اور ضمیر سب مل کر اخلاقی اصولوں کے تابع ہو جائیں۔

3-سماجی اخلاقیات کے معاصر پہلو

جدید انسانی معاشرہ سائنسی ترقی، ٹیکنالوجی کے پھیلاؤ، اقتصادی پیچیدگیوں اور ثقافتی تنوع کے باعث اخلاقی اعتبار سے ایک پیچیدہ میدان میں داخل ہو چکا ہے۔ جہاں ایک طرف انسان نے اپنی زندگی کو سہل اور مؤثر بنایا ہے وہیں دوسری طرف اس نے کئی ایسے سوالات کھڑے کر دیے ہیں جن کے جواب دینا اخلاقی نظاموں کے لیے کسی چیلنج سے کم نہیں۔ ان سوالات نے نہ صرف روایتی اخلاقیات کی بنیادوں کو ہلا دیا ہے بل کہ انسان کے فکری، روحانی اور تمدنی وجود پر بھی گہرے اثرات ڈالے ہیں۔

3.1 –اخلاقی نسبیت(Moral Relativism)

یہ سوال کہ کیا اخلاقی اقدار مطلق ہیں یا نسبتی، جدید انسانی فکر کا سب سے بڑا مخمصہ بن چکا ہے۔ جدید دنیا میں "اخلاقی نسبیت" کا رجحان بڑھ رہا ہے جس کے مطابق ہر معاشرہ، ہر فرد اور ہر ثقافت اپنے الگ اخلاقی اصول رکھ سکتی ہے اور ان کا کوئی مشترک معیار نہیں۔

یہ سوچ اگرچہ رواداری اور اختلافِ رائے کی گنجایش پیدا کرتی ہے مگر آخر کار اخلاقی انتشار اور اقدار کی تحلیل کا باعث بنتی ہے۔ ایسے میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا ظلم، ناانصافی یا فریب جیسے افعال کسی بھی حال میں درست قرار دیے جا سکتے ہیں؟ اگر ہر شے نسبتی ہو جائے تو پھر حق و باطل کا تصور کہاں باقی رہتا ہے؟

3.2۔انفرادی آزادی بمقابلہ اجتماعی خیر(Individual Freedom vs. Social Good)

جدید لبرل فکر نے فرد کو خود مختار اور ذاتی آزادی کا مالک قرار دیا ہے، مگر جب یہی آزادی اجتماعی مفاد سے متصادم ہوتی ہے تو اخلاقی کشمکش جنم لیتی ہے۔

اظہارِ رائے کی آزادی کب نفرت انگیزی بن جاتی ہے؟ ذاتی کاروباری مفاد کب عوامی استحصال میں بدل جاتا ہے؟ طرزِ زندگی کے انفرادی انتخاب کب خاندانی یا سماجی اقدار کو مجروح کرتے ہیں؟

یہ محض قانونی نہیں بل کہ اخلاقی سوالات ہیں جن کا کوئی آسان جواب نہیں، کیوں کہ جدید معاشرہ آزادی کو مطلق مانتا ہے، جب کہ ہر اجتماعی نظام کسی نہ کسی اخلاقی ضابطے کا پابند ہوتا ہے۔

3.3۔ تکنیکی ترقی اور اخلاقی بحران (Technological Progress and Moral Crisis)

ٹیکنالوجی نے انسان کو مادی طور پر بے پناہ ترقی دی ہے، لیکن اس نے اخلاقی میدان میں بھی نئے اور پیچیدہ سوالات پیدا کر دیے ہیں۔

- مصنوعی ذہانت (AI) کے فیصلوں کی اخلاقی ذمہ داری کس پر عائد ہو گی؟
- حیاتیاتی تجربات (Bioethics) مثلاً ابارشن، رحمتی موت، اور جینیاتی ترمیم جیسے مسائل کہاں تک جائز ہیں؟
- سوشل میڈیا نے معلومات کی آزادی کے ساتھ ساتھ جھوٹ، بدنامی، نفرت اور رازداری کی پامالی جیسے بحران بھی پیدا کیے ہیں۔

یہ تمام چیلنجز انسان سے تقاضا کرتے ہیں کہ وہ صرف سائنسی یا قانونی پیمانوں پر نہیں بل کہ اخلاقی بصیرت اور انسانی کرامت کے اصولوں پر بھی ان کا جائزہ لے۔ ان تمام پہلوؤں کا تقاضا ہے کہ انسان اپنے اخلاقی ضمیر کو از سرِ نو بیدار کرے اور ایسی جامع اخلاقیات تشکیل دے جو عقل و علم کے ساتھ روحانیت، فطرت اور تمدن کی ہم آہنگی پیدا کرے۔ محض سائنسی یا قانونی ضابطے اس خلا کو پر نہیں کر سکتے جب تک انسان اپنی اخلاقی بنیادوں کو آسمانی ہدایت اور عالم گیر انسانی شعور سے نہ جوڑ دے۔ یہی وہ راستہ ہے جو موجودہ معاشرے کو اخلاقی انتشار سے نکال کر ایک منصفانہ، متوازن اور پُرامن اجتماعی زندگی کی طرف لے جا سکتا ہے۔

4- سماجی اخلاقیات کی عملی اہمیت

اخلاق اگر صرف کتابوں کی زینت بن کر رہ جائے یا محض واعظوں کے بیانات کا حصہ بنے، تو وہ معاشرتی انقلاب پیدا نہیں کر سکتا۔ اخلاق کی اصل قدر و قیمت اس وقت سامنے آتی ہے جب وہ انسان کے رویّے، معاملات اور اجتماعی زندگی میں ایک روشن روش بن کر ظاہر ہو۔ اخلاق کی تاثیر کا حقیقی میدان فرد کی روزمرہ زندگی ہے، جہاں وہ دوسروں کے ساتھ اپنے تعلقات، لین دین اور ذمہ داریوں میں ان اصولوں کو اختیار کرتا ہے جو سماج کو پُرامن، منصف اور مہذب بناتے ہیں۔

4.1—انفرادی سطح پر اخلاقی عمل کی اہمیت

فرد کسی بھی معاشرے کی بنیادی اکائی ہے۔ اگر ہر فرد اپنی ذات میں اخلاقی اصولوں کا پابند ہو تو پورا سماج خود بہ خود منظم اور متوازن ہو جائے۔ ایک سچا انسان اپنے معاملات میں دیانت دار ہوتا ہے، زبان میں سچائی رکھتا ہے، دوسروں کے حقوق کا خیال کرتا ہے اور اپنے فرائض کو پوری ذمہ داری کے ساتھ ادا کرتا ہے۔ یہی رویّے جب اجتماعی صورت اختیار کرتے ہیں تو ایسا ماحول وجود میں آتا ہے جس میں اعتماد، رواداری اور باہمی تعاون پروان چڑھتے ہیں۔

قرآن مجید ہمیں بار بار مخاطب کرتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ

یعنی ہر شخص اپنے قول و عمل میں اللہ کا خوف دل میں رکھے اور اخلاقی اصولوں کی پاس داری کرے، خواہ وہ لوگوں کے درمیان ہو یا تنہائی میں۔ یہی احساسِ تقویٰ اخلاقی پختگی کی بنیاد ہے۔

4.2—معاشرتی سطح پر اخلاقیات کا اثر

جس معاشرے میں عدل و انصاف رائج ہو، دیانت کو عزت حاصل ہو، اور ایثار و قربانی کو مقام حاصل ہو، وہ معاشرہ حقیقی فلاح کی راہ پر گام زن ہوتا ہے۔ ایسے معاشرے میں افراد کا باہمی رشتہ اعتماد اور احترام پر قائم ہوتا ہے، ادارے مضبوط ہوتے ہیں، اور ریاست اپنے مقاصد کو احسن طریقے سے حاصل کر سکتی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے مدینہ کے معاشرے کی بنیاد جس چیز پر رکھی، وہ محض قوانین یا معاہدات نہ تھے بل کہ آپؐ نے ایک ایسا اخلاقی ماحول قائم کیا جہاں ہر شخص جانتا تھا کہ اس کا ہر عمل اللہ کے ہاں جواب دہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ معاشرہ تاریخِ انسانی کا روشن ترین نمونہ بن گیا۔

شیخ الاسلام ابنِ تیمیہؒ نے عدل کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک اصولی نکتہ بیان کیا ہے:

»وَلِهَذَا قِيلَ: إِنَّ اللَّهَ يُقِيمُ الدَّوْلَةَ الْعَادِلَةَ وَإِنْ كَانَتْ كَافِرَةً، وَلَا يُقِيمُ الظَّالِمَةَ وَإِنْ كَانَتْ مُسْلِمَةً«.

(مجموع الفتاویٰ، ج ۲۸، ص ۱۴۶)

اس قول کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انصاف پر قائم رہنے والی حکومت کو دوام عطا کرتا ہے، خواہ وہ ظاہراً غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو،

لیکن وہ ظلم و ناانصافی پر مبنی حکومت کو باقی نہیں رکھتا، چاہے وہ بظاہر اسلامی نام ہی کیوں نہ رکھتی ہو۔ یعنی ریاستوں اور قوموں کی بقا کا اصل راز ایمان کے ظاہری دعوے میں نہیں، بل کہ عدل وانصاف کے عملی قیام میں پوشیدہ ہے۔

4.3– قومی وبین الاقوامی سطح پر اثرات

جب دنیا ایک ''عالمی گاؤں'' میں بدل چکی ہے، تو اخلاقیات کی اہمیت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ایک قوم اگر اپنے بین الاقوامی تعلقات میں انصاف، دیانت، وعدے کی پاس داری اور انسان دوستی کا مظاہرہ کرے تو وہ عالمی سطح پر عزت و وقار حاصل کرتی ہے۔

اس کے برعکس وہ قومیں جو صرف اپنے مفادات کے لیے دوسروں کا استحصال کرتی ہیں، وقتی طور پر طاقت ور نظر آتی ہیں مگر بالآخر تاریخ کے اوراق میں عبرت کا عنوان بن جاتی ہیں۔ حقیقی پائیداری صرف اسی قوم کو حاصل ہوتی ہے جو اپنی پالیسیوں میں اخلاقی اصولوں کو بنیاد بنائے۔

المختصر، اخلاقیات محض نظری مباحث کا عنوان نہیں بل کہ ایک زندہ اور متحرک حقیقت ہے جو فرد کی زندگی سے لے کر عالمی تعلقات تک ہر سطح پر اثر انداز ہوتی ہے۔ یہی اخلاقی شعور انسان کو ایک مہذب شہری، معاشرے کو ایک منصفانہ نظام اور دنیا کو امن و آشتی کا گہوارہ بناتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم اخلاقی اصولوں کو محض جاننے پر ہی اکتفانہ کریں، اپنی عملی زندگی میں ان پر عمل کو اپنی ذمہ داری بھی سمجھیں۔

5-خلاصہ

سماجی اخلاقیات دراصل انسان کے اجتماعی شعور کی وہ بنیاد ہے جو انصاف، ہمدردی، رواداری اور دیانت کے اصولوں پر معاشرے کو قائم رکھتی ہے۔ یہ محض مذہبی یا فلسفیانہ بحث نہیں، بل کہ انسانی تمدن کی بقا اور امن کے لیے ایک عملی ضرورت ہے۔ جب فرد اپنے کردار میں صداقت اور عدل کو جگہ دیتا ہے تو یہی روش پورے معاشرے میں توازن، اعتماد اور فلاح پیدا کرتی ہے۔ جدید دنیا کے پیچیدہ مسائل کا حل بھی اسی میں ہے کہ انسان اپنی سائنسی و فکری ترقی کو اخلاقی بصیرت کے تابع رکھے۔ یہی اخلاقیات تعمیرِ شخصیت کے ان آفاقی اصولوں میں سے ایک ہے جو انسان کو نہ صرف ایک اچھا شہری، بل کہ ایک بہتر انسان بناتے ہیں۔

قرآنِ مجید نے انسانی برادری کے اخلاقی نصب العین کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (.الحجرات: 13)

یہ آیت سماجی اخلاقیات کی اعلیٰ ترین روح کو واضح کرتی ہے کہ انسانوں کی فضیلت رنگ، نسل یا طاقت میں نہیں بل کہ تقویٰ میں ہے جو انصاف اور اخلاقی برتری کی اصل بنیاد ہے۔

خود آزمائی

1. سماجی اخلاقیات سے کیا مراد ہے؟ اس کے بنیادی اجزا اور معاشرتی اہمیت کو وضاحت سے بیان کیجیے۔
2. امام غزالی اور ابنِ مسکویہ کے نزدیک "خُلق" کی تعریف میں کیا فرق ہے، اور یہ فرق سماجی اخلاقیات کے فہم میں کس طرح مدد دیتا ہے؟
3. قرآنِ مجید میں عدل و احسان کی تعلیمات سماجی زندگی کے استحکام میں کیا کردار ادا کرتی ہیں؟ دو مثالوں سے واضح کیجیے۔
4. افلاطون اور ارسطو کے اخلاقی نظریات کو سماجی نظم و انصاف کے تناظر میں بیان کیجیے۔
5. جدید فلسفہ (کانٹ یا جان اسٹورٹ مل) میں اخلاقی فیصلے کے معیار کو بیان کیجیے اور بتایے کہ یہ سماجی اخلاقیات سے کس حد تک ہم آہنگ ہے۔
6. جدید معاشرے میں "اخلاقی نسبیت" اور "انفرادی آزادی" جیسے نظریات نے اجتماعی اخلاقی نظام پر کیا اثرات ڈالے ہیں؟
7. تکنیکی ترقی (جیسے مصنوعی ذہانت یا سوشل میڈیا) کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اخلاقی چیلنجز پر تبصرہ کیجیے۔
8. فرد کی سطح پر اخلاقی عمل سماج کی تعمیر میں کیا کردار ادا کرتا ہے؟ مثالوں سے وضاحت کیجیے۔
9. ''عدل کے بغیر ریاست باقی نہیں رہ سکتی'' — اس قول کا مفہوم بیان کیجیے اور اسے موجودہ معاشرتی حالات پر منطبق کیجیے۔

یونٹ:4

کاروباری اخلاقیات

مصنف: ڈاکٹر محمود احمد

نظرِ ثانی: ڈاکٹر حامد حماد

فہرست عنوانات

یونٹ:4 49

کاروباری اخلاقیات 49

مصنف: ڈاکٹر محمود احمد 49

نظرِ ثانی: ڈاکٹر حامد حماد 49

یونٹ کا تعارف 52

یونٹ کے مقاصد 52

1-کاروباری اخلاقیات: ایک بنیادی تعارف 54

2-کاروباری اخلاقیات: تعریف اور دائرۂ کار 55

2.1-کاروباری اخلاقیات کی تعریف 55

2.2-کاروباری اخلاقیات کا دائرۂ کار 56

2.2.1-تجارتی لین دین میں دیانت و شفافیت 57

2.2.2-صارفین، ملازمین اور شراکت داروں کے ساتھ منصفانہ رویہ 57

2.2.3-ماحولیاتی اور سماجی ذمہ داریاں 57

3-کاروباری اخلاقیات کے بنیادی اصول 58

3.1-دیانت داری اور سچائی 58

3.2-انصاف اور برابری 59

3.3-شفافیت اور جواب دہی 60

3.4-وعدے اور معاہدات کی پاس داری 62
3.5-مقابلے میں اخلاقی رویہ 62
حاصلِ کلام 63
4-کاروباری اخلاقیات کی بنیادیں 63
4.1-مذہبی بنیادیں 63
4.2-نفلسفیانہ بنیادیں 64
4.3-سماجی و ثقافتی بنیادیں 66
4.4-قانونی و آئینی بنیادیں 66
خود آزمائی 68

یونٹ کا تعارف

زندگی کے تمام شعبے خواہ وہ علمی ہوں یا عملی، ان کے استحکام اور ترقی کا دار و مدار اس امر پر ہوتا ہے کہ ان میں اخلاقی اصولوں کو کس حد تک ملحوظ رکھا گیا ہے۔ یہ اصول ہی وہ اساس فراہم کرتے ہیں جس پر معاشرے کے افراد ایک دوسرے پر اعتماد قائم کرتے اور باہمی لین دین میں حسن و خوبی کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ تجارت، جسے دنیا کے قدیم ترین پیشوں میں شمار کیا جاتا ہے، محض خرید و فروخت کا نام نہیں بل کہ یہ ایک ایسا سماجی فریضہ ہے جس کے توسط سے انسانی تمدن کی بنیادیں مستحکم ہوتی اور اقوام کی معیشتیں پروان چڑھتی ہیں۔ اگر اس میدان میں دیانت، راست بازی اور اصول پسندی کا فقدان ہو تو نہ صرف مالی نقصان ہوتا ہے بل کہ ایک پورا معاشرتی نظام انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔

یہ یونٹ اسی پہلو پر روشنی ڈالے گا کہ کاروباری اخلاقیات کا مفہوم کیا ہے اور انسانی سوسائٹی میں اس کی اہمیت کیا ہے۔ ہم سب سے پہلے ان بنیادی اصولوں پر غور کریں گے جو کسی بھی تجارتی معاملے میں مطلوب ہوتے ہیں، پھر اس حقیقت کا جائزہ لیں گے کہ ان اصولوں سے انحراف کے نتیجے میں کس قسم کے اخلاقی، سماجی اور اقتصادی بحران جنم لیتے ہیں۔ اسلامی تعلیمات اور سیرتِ طیبہ کی روشنی میں تجارتی اخلاقیات کا ایک خاکہ بھی پیش کیا جائے گا تاکہ یہ واضح ہو کہ شریعت نے کسبِ معاش کے اس پہلو میں کس درجہ احتیاط برتنے کی تلقین فرمائی ہے۔ بعد ازاں جدید کاروباری دنیا میں اخلاقیات کی عملی صورت اور اس حوالے سے درپیش چیلنجز پر گفت گو کی جائے گی۔

یہ مطالعہ اس غرض سے مرتب کیا گیا ہے کہ طلبہ نہ صرف کاروباری اخلاقیات کے اصولی پہلوؤں کو سمجھ سکیں بل کہ اس شعور سے بھی بہرہ مند ہوں کہ عملی زندگی میں ان اصولوں پر کاربند رہنا فرد اور معاشرے دونوں کے لیے کس قدر ضروری ہے۔

یونٹ کے مقاصد

امید ہے کہ اس یونٹ کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1. کاروباری اخلاقیات کے بنیادی مفہوم اور اس کی علمی و عملی حیثیت کو واضح طور پر سمجھ سکیں گے۔
2. کاروباری اخلاقیات کی بنیادوں مثلاً وحی، عقل، سماج، اور انسانی تجربے، کی شناخت اور ان کے باہمی تعلق کو سمجھنے کے قابل ہوں گے۔
3. اسلامی اور غیر مذہبی مفکرین (جیسے افلاطون، ایڈم اسمتھ، پیٹر ڈرکر وغیرہ) کے نظریات کا تقابلی مطالعہ کر کے اخلاقی تصورات کے ارتقا کو جان سکیں گے۔
4. کاروباری اخلاقیات کے بنیادی اصولوں، دیانت، انصاف، شفافیت، امانت داری اور خیر خواہی، کو مختلف عملی مثالوں کے ساتھ بیان کر سکیں گے۔
5. کاروباری اخلاقیات کی ضرورت و اہمیت کا ادراک حاصل کریں گے اور سمجھ سکیں گے کہ ان اصولوں کے بغیر کوئی معاشی نظام پائیدار کیوں نہیں رہ سکتا۔
6. اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں اخلاقی رویوں کے نفاذ کے لیے عملی رہ نمائی حاصل کریں گے اور خود کو ایک ذمہ دار، دیانت دار اور کام یاب فرد کے طور پر تشکیل دے سکیں گے۔

1-کاروباری اخلاقیات: ایک بنیادی تعارف

کاروبار بظاہر ایک مادی سرگرمی ہے، جس میں اشیاو خدمات کی خرید و فروخت، نفع و نقصان کے حسابات، اور معاہدات و لین دین کے معاملات شامل ہوتے ہیں۔ لیکن اگر اس کے پسِ پشت کارفرما اصولوں پر نظر ڈالی جائے، تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ محض دولت کا حصول یا اشیا کی ترسیل اس کا اصل جوہر نہیں، بل کہ اس کے ساتھ کچھ ایسے غیر مرئی عناصر بھی وابستہ ہیں جو اسے انسانی معاشرت میں ایک مہذب اور بامقصد سرگرمی کا درجہ عطا کرتے ہیں۔ انہی میں سب سے نمایاں چیز "اخلاقیات" ہے۔

ایک تاجر خواہ کتنا ہی ماہر اور چالاک کیوں نہ ہو، جب تک اس کے معاملات میں سچائی، دیانت اور انصاف کی روش شامل نہ ہو، اس کی تجارت محض فریب یا استحصال کا نمونہ بن کر رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے ہر مہذب تمدن میں کاروباری اخلاقیات کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے اور اس پر مستقل قوانین و اصول مرتب کیے گئے ہیں۔

تاہم اخلاقیات کا دائرہ صرف ظاہری قوانین تک محدود نہیں بل کہ یہ اس داخلی شعور اور ضمیر کے احساس سے جنم لیتی ہے جو انسان کو نیکی اور بدی، جائز اور ناجائز کے درمیان تمیز کرنے کی صلاحیت عطا کرتا ہے۔ چناں چہ جب ہم "کاروباری اخلاقیات" کی بات کرتے ہیں تو اس سے مراد صرف وہ رسمی قواعد و ضوابط نہیں ہوتے جو حکومتوں یا تجارتی اداروں نے طے کیے ہیں، بل کہ وہ اعلیٰ انسانی اصول بھی اس میں شامل ہوتے ہیں جو صداقت، دیانت اور حسنِ معاملہ پر مبنی ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جو تجارت کو محض مال و زر کی دوڑ سے نکال کر ایک ایسی سرگرمی میں تبدیل کرتی ہے جس کے ذریعے نہ صرف افراد بل کہ پورا معاشرہ فائدہ پاتا ہے۔

اگر اخلاقیات کی بنیاد کو سمجھنے کی کوشش کی جائے، تو یہ دراصل ان اصولوں اور ضوابط کا مجموعہ ہے جو انسانی زندگی میں صحیح اور غلط، جائز اور ناجائز اور نیکی و بدی کے درمیان تمیز قائم کرتے ہیں۔ گویا اخلاقیات محض ایک نظری بحث نہیں بل کہ عملی زندگی میں ایک مستقل رہ نما قوت ہے جو نہ صرف فرد کی ذاتی زندگی کو سنوارتی ہے بل کہ اس کے سماجی اور معاشی تعلقات میں بھی توازن اور عدل پیدا کرتی ہے۔

انسانی تمدن کی تاریخ سے واضح ہوتا ہے کہ کوئی بھی معاشرہ محض مادی قوانین کے سہارے قائم نہیں رہ سکتا بل کہ اسے ایسے اخلاقی اصولوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو افراد میں دیانت، امانت اور احساسِ ذمہ داری پیدا کریں۔

یہی اصول کاروباری دنیا پر بھی صادق آتے ہیں۔ اگر تجارت کو نفع اندوزی کی ایک اندھی دوڑ سمجھ لیا جائے، جہاں کسی قاعدے، کسی ضابطے، کسی اصول کی کوئی اہمیت نہ ہو، تو جلد یا بدیر اس کا نتیجہ دھوکے، بدعنوانی اور استحصال کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ترقی یافتہ قوم اپنے تجارتی نظام میں اخلاقی اصولوں کو بنیادی حیثیت دیتی ہے۔

اسلامی تعلیمات میں بھی اخلاقیات کو محض ایک ضمنی چیز نہیں سمجھا گیا بل کہ اسے ہر انسانی عمل کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

»التَّاجِرُ الصَّدُوقُ الأَمِينُ مَعَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ(«سُنن الترمذی، حدیث: **1209**)

یعنی '' : سچا اور امانت دار تاجر قیامت کے دن نبیوں، صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہو گا۔''

اس ارشادِ نبویؐ میں جہاں ایمانداری کی اہمیت بیان کی گئی ہے، وہیں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ کاروباری دنیا میں اخلاقی اصولوں کی پاس داری صرف دنیاوی کام یابی کا ذریعہ نہیں بل کہ اخروی نجات و عزت کا بھی سبب ہے۔

2-کاروباری اخلاقیات: تعریف اور دائرۂ کار

2.1-کاروباری اخلاقیات کی تعریف

انسانی زندگی کے جملہ معاملات چند بنیادی اصولوں کے تحت چلتے ہیں اور ہر مہذب معاشرہ انہی اصولوں کی پاس داری کو اپنی بقا اور ترقی کے لیے ناگزیر سمجھتا ہے۔ اخلاقیات دراصل انہی اصولوں اور اقدار کا مجموعہ ہے جو

افراد اور اداروں کے طرزِ عمل کو منصفانہ اور بہتر خطوط پر استوار کرتے ہیں۔ جب یہی اصول تجارت، معیشت اور صنعت کے میدان میں بروے کار آتے ہیں، تو انھیں "کاروباری اخلاقیات" کہا جاتا ہے۔

کاروباری اخلاقیات محض قانونی تقاضوں کی تکمیل کا نام نہیں بل کہ ان اعلیٰ انسانی اقدار پر عمل پیرا ہونے کا مظہر ہیں جو ایک تاجر، صنعت کار یا سرمایہ کار کو انصاف، دیانت، شفافیت اور خیر خواہی اختیار کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ کسی بھی کاروبار میں فریب، دھوکا دہی، غیر منصفانہ تجارت یا صارفین کے ساتھ زیادتی نہ صرف قانونی اعتبار سے قابلِ گرفت عمل ہے، بل کہ اخلاقی لحاظ سے بھی ناپسندیدہ رویہ شمار ہوتا ہے۔

اس ضمن میں مختلف مفکرین نے کاروباری اخلاقیات کی متنوع تعریفیں پیش کی ہیں۔

ایڈم اسمتھ اپنی تصنیف The Theory of Moral Sentiments میں عدل کو انسانی معاشرت کا ستون قرار دیتے ہیں اور واضح کرتے ہیں کہ اگر عدل ختم ہو جائے تو معاشرہ ٹوٹ جاتا ہے؛ یہی اصول معیشت پر بھی منطبق ہوتا ہے کیوں کہ دیانت اور انصاف کے بغیر کوئی اقتصادی نظام دیر پا ترقی نہیں کر سکتا۔

اسی طرح جدید اخلاقی فلسفے کے ممتاز ماہر رچرڈ ڈی جورج کے نزدیک کاروباری اخلاقیات دراصل عمومی اخلاقی تصورات کا کاروباری طرزِ عمل پر اطلاق ہے۔ یہ محض نفع کے حصول تک محدود نہیں بل کہ تمام کاروباری معاملات میں انصاف، دیانت اور منصفانہ رویے سے بھی متعلق ہے۔(Business Ethics)

یہ تعریفیں اس حقیقت کو نمایاں کرتی ہیں کہ کاروبار محض لین دین یا دولت کے حصول کا نام نہیں بل کہ اس کی بنیاد ایمانداری، دیانت داری اور انصاف جیسی اعلیٰ قدروں پر قائم ہے۔ جب کسی معیشت میں ان اصولوں کو نظر انداز کیا جاتا ہے، تو وہ بظاہر خوش حال ہونے کے باوجود پائیدار ترقی سے محروم ہو جاتی ہے۔

2.2-کاروباری اخلاقیات کا دائرۂ کار

کاروباری اخلاقیات چند اصولوں یا قوانین کی فہرست نہیں بل کہ ایک ہمہ گیر نظامِ عمل ہے جو کاروباری سرگرمیوں کے ہر پہلو پر محیط ہے۔ کسی بھی تجارت میں دیانت داری، شفافیت، اور منصفانہ رویہ بنیادی ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے بغیر کوئی بھی تجارتی یا صنعتی نظام دیر پا ترقی حاصل نہیں کر سکتا۔

2.2.1- تجارتی لین دین میں دیانت وشفافیت

کوئی بھی کاروبار، خواہ چھوٹے پیمانے پر ہو یا بین الاقوامی سطح پر، دیانت داری کے بغیر ترقی نہیں کر سکتا۔ دھوکا دہی، جھوٹی تشہیر، ناپ تول میں کمی، اور غیر شفاف مالی لین دین—یہ تمام امور کاروباری اخلاقیات کے منافی ہیں۔

رسولِ اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

مَن غَشَّ فَلَيْسَ مِنِّي

(صحیح مسلم، حدیث:102)

یعنی "جس نے دھوکا دیا، وہ مجھ سے نہیں۔"

یہ اصول جدید معیشت میں بھی مسلمہ حقیقت کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ دیانت اور انصاف کے بغیر کوئی معیشت حقیقی خوش حالی حاصل نہیں کر سکتی۔

2.2.2- صارفین، ملازمین اور شراکت داروں کے ساتھ منصفانہ رویہ

کاروباری اخلاقیات کا ایک بنیادی تقاضا یہ ہے کہ صارفین، ملازمین، اور تجارتی شرکا کے ساتھ انصاف و دیانت سے پیش آیا جائے۔ صارفین کو معیاری اشیا مناسب قیمت پر فراہم کرنا، ملازمین کے حقوق کی بروقت ادائیگی، اور شراکت داروں سے کیے گئے عہد و معاہدوں کی پاس داری، یہ سب اخلاقی ذمہ داریاں ہیں۔

کاروباری تعلقات میں اعتماد یہ ہے کہ ایک فریق دوسرے کے طرزِ عمل کے مقابل خود کو رضاکارانہ طور پر خطرے کے قابل بناتا ہے، اس توقع کے ساتھ کہ دوسرا فریق امانت داری سے وہ کام کرے گا جو اس کے ذمے ہے، چاہے اسے مسلسل نگرانی سے جانچا نہ جا سکے۔ یہی اعتماد صارفین، ملازمین اور شراکت داروں کے منصفانہ برتاؤ کی بنیاد ہے۔

2.2.3- ماحولیاتی اور سماجی ذمہ داریاں

جدید دنیا میں "کارپوریٹ سماجی ذمہ داری (Corporate Social Responsibility - CSR)" ایک معروف اصطلاح ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ کاروباری ادارے

صرف منافع کمانے پر توجہ نہ دیں، بل کہ ماحول، معاشرے، اور مجموعی سماجی ترقی میں بھی کردار ادا کریں۔ صنعتی آلودگی میں کمی، قدرتی وسائل کے غیر ضروری استعمال سے اجتناب، اور فلاحی منصوبوں میں شمولیت؛ یہ سب کام یاب اور مہذب اداروں کی پہچان ہیں۔

3-کاروباری اخلاقیات کے بنیادی اصول

کاروباری اخلاقیات کی بنیاد ایسے اصولوں پر ہے جو نہ صرف تجارت میں دیانت اور شفافیت کو یقینی بناتے ہیں بل کہ ایک ایسا نظام تشکیل دیتے ہیں جس میں فرد، سماج اور معیشت سبھی ترقی کی راہ پر گام زن ہو سکیں۔ یہ اصول نہ صرف اسلامی تعلیمات میں راسخ ہیں بل کہ انسانی فطرت اور جدید اقتصادی نظریات بھی ان کی تائید کرتے ہیں۔

3.1-دیانت داری اور سچائی

کاروباری دنیا میں سچائی اور دیانت داری وہ صفات ہیں جن پر ایک کام یاب اور پائیدار تجارت کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ جو معاشرے دیانت کو نظر انداز کر دیتے ہیں وہ زیادہ دیر تک اقتصادی ترقی برقرار نہیں رکھ سکتے۔ اسی لیے اسلامی تعلیمات میں سچائی کو تجارت کی جان قرار دیا گیا ہے۔

رسولِ اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

»اَلْبَيِّعَانِ بِالْخِيَارِ مَا لَمْ يَتَفَرَّقَا، فَإِنْ صَدَقَا وَبَيَّنَا، بُورِكَ لَهُمَا فِي بَيْعِهِمَا، وَإِنْ كَتَمَا وَكَذَبَا، مُحِقَ بَرَكَةُ بَيْعِهِمَا«

(صحیح بخاری، حدیث:2079)

یعنی: ''خرید و فروخت کرنے والے جب تک جدا نہ ہوں ان کو اختیار ہے۔ اگر وہ سچ بولیں اور چیز کی حقیقت بیان کر دیں تو ان کی تجارت میں برکت ڈال دی جاتی ہے اور اگر جھوٹ بولیں اور عیب چھپائیں تو ان کی تجارت سے برکت ختم کر دی جاتی ہے۔''

یہی اصول جدید معیشت میں بھی تسلیم شدہ ہے۔ ایڈم اسمتھ اپنی شہرۂ آفاق تصنیف The Theory of Moral Sentiments میں عدل کو انسانی معاشرت کا ستون قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ "عدل

وہ ستون ہے جس پر انسانی سماج کی پوری عمارت قائم ہے؛ اگر اسے ہٹا دیا جائے تو یہ عظیم الشان عمارت لمحوں میں بکھر جاتی ہے۔"

ظاہر ہے کہ اس کا اطلاق معیشت پر بھی ہوتا ہے۔

3.2۔انصاف اور برابری

کاروبار میں عدل وانصاف صرف اخلاقی اصول نہیں بل کہ عملی ضرورت بھی ہے۔ اگر کسی ادارے میں ملازمین کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جائے اجرت میں ناحق کمی کی جائے یا صارفین کو غیر معیاری اشیا فراہم کی جائیں تو یہ نہ صرف غیر اخلاقی ہے بل کہ طویل المیعاد نقصان کا باعث بھی ہے۔

افلاطون اپنی تصنیف The Republic میں لکھتے ہیں کہ عدالت یہ ہے کہ ہر فرد وہی کام کرے جس کے لیے وہ اپنی فطرت کے اعتبار سے موزوں ہے؛ یہی توازن معاشرت کے استحکام کی ضمانت بنتا ہے۔

(ماخوذ از: Plato, The Republic, Book IV, 433a–b)

اسلامی تعلیمات میں بھی تجارتی معاملات میں انصاف پر غیر معمولی زور دیا گیا ہے۔ قرآنِ مجید میں ارشاد ہے:

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَوْ وَزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ

(سورۃ المطففین: 1–3)

یعنی: ''تباہی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لیے جو جب خود لیتے ہیں تو پورا لیتے ہیں اور جب دوسروں کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کمی کرتے ہیں۔''

مذکورہ آیت سے واضح ہے کہ تجارت میں انصاف مذہبی فریضہ ہونے کے ساتھ ساتھ معاشی استحکام کا ضامن بھی ہے۔

امام غزالی فرماتے ہیں کہ ''اللہ نے عدل اور احسان دونوں کا حکم دیا ہے؛ تجارت میں عدل کی حیثیت اصل سرمایہ اور احسان کی حیثیت نفع کی سی ہے۔'' (إحیاء علوم الدین، کتاب آداب الکسب والمعاش، الباب الرابع)

3.3-شفافیت اور جواب دہی

ایک اچھے تجارتی نظام میں شفافیت (Transparency) اور جواب دہی (Accountability) بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ آج دنیا میں کئی بین الاقوامی ادارے، مثلاً OECD ، World Bank، اور ISO ، مالیاتی اور ادارہ جاتی شفافیت پر زور دیتے ہیں، کیوں کہ بدعنوانی، خفیہ معاہدات اور غیر منصفانہ فیصلے کسی بھی معیشت کی بنیاد کو کم زور کر دیتے ہیں۔

OECD کے مطابق:

"The corporate governance framework should ensure that timely and accurate disclosure is made on all material matters regarding the corporation, including the financial situation, performance, ownership, and governance of the company."

(OECD Principles of Corporate Governance, Chapter V: Disclosure and Transparency)

یعنی "کارپوریٹ گورننس کا فریم ورک اس بات کو یقینی بنائے کہ کمپنی سے متعلق تمام اہم امور — مثلاً "مالی حالت، کارکردگی، ملکیت اور حکمرانی — پر بروقت اور درست انکشاف کیا جائے۔

اسی طرح **ISO 26000:2010** جو ادارہ جاتی سماجی ذمہ داری کی معروف دستاویز ہے، شفافیت کو ایک بنیادی اخلاقی اول قرار دیتی ہے:

"The principle is: an organization should be transparent in its decisions and activities that impact on society and the environment."

(ISO 26000:2010 — Guidance on Social Responsibility, Section4.3)

یعنی ''کسی ادارے کو اپنے اُن فیصلوں اور سر گرمیوں میں شفاف ہونا چاہیے جو معاشرے اور ماحول پر اثرانداز ہوتی ہیں۔''

World Bank نے بھی اپنی پالیسیوں میں شفافیت اور جواب دہی کو نیک حکم رانی (Good Governance) کی اساس قرار دیا ہے۔ایک سرکاری خطاب میں کہا گیا:

"What does good governance require? It requires credible and trustworthy institutions built on principles of transparency and accountability."

(World Bank Keynote Address: Transparency & Public Accountability — The Core of Good Corporate Governance, 2018)

یعنی ''اچھے طرزِ حکم رانی کی بنیاد ایسے معتبر اور قابلِ اعتماد ادارے ہیں جو شفافیت اور جواب دہی کے اصولوں پر قائم ہوں۔''

یہ تمام حوالہ جات اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ شفافیت صرف قانونی تقاضا نہیں بل کہ ایک اخلاقی اور تمدنی ضرورت ہے۔ کاروباری دنیا میں جب ادارے اپنے مالی، انتظامی، اور سماجی معاملات میں کھلے پن اور جواب دہی کا طرزِ عمل اپناتے ہیں، تو ان کے اندر اعتماد، دیانت اور پائیداری جنم لیتی ہے—اور یہی کسی معیشت کی اصل قوت ہے۔

رسولِ اکرم ﷺ نے بھی انتظامی نظم میں امانت داری اور جواب دہی کی اہمیت واضح فرمائی:

»مَنِ اسْتَعْمَلْنَاهُ عَلَى عَمَلٍ فَرَزَقْنَاهُ رِزْقًا فَمَا أَخَذَ بَعْدَ ذَلِكَ فَهُوَ غُلُولٌ«

(سنن ابی داؤد، حدیث: 2943)

یعنی: ''جسے ہم کسی کام پر مقرر کریں اور اس کا وظیفہ مقرر کر دیں پھر وہ اس کے علاوہ کچھ لے تو وہ خیانت ہے۔''

یہ ارشاد واضح کرتا ہے کہ شفافیت، جواب دہی اور دیانت داری اسلامی معیشت کی اساس ہیں۔

3.4-وعدے اور معاہدات کی پاس داری

کاروبار میں کیے گئے وعدے اور معاہدات صرف قانونی نہیں بل کہ اخلاقی ذمہ داری بھی ہوتے ہیں۔ اسلامی تعلیمات میں عہد کی پاس داری کو ایمان کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ قرآنِ مجید میں ارشاد ہے:

»يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ« (سورۃالمائدہ:1)

یعنی: ''اے ایمان والو! معاہدات کو پورا کرو۔''

یہ اصول واضح کرتا ہے کہ معاہدات کی دیانت داری دراصل تجارت کا اخلاقی ضمیر ہے۔

3.5-مقابلے میں اخلاقی رویہ

کاروباری دنیا میں مقابلہ انسانی تمدن اور اقتصادی سرگرمی کا ایک لازمی اور فطری جزو ہے لیکن اس حقیقت کے باوجود یہ تقاضا کرتا ہے کہ اس کی بنیاد دیانت، شفافیت اور انصاف پر رکھی جائے۔ حقیقی مسابقت وہ ہے جو معیار، جدّت اور خدمت کے ذریعے بہتر بننے کا جذبہ پیدا کرے، نہ کہ مخالفین کو نقصان پہنچانے، ان کی ساکھ خراب کرنے یا ناجائز ذرائع سے برتری حاصل کرنے کا ذریعہ بنے۔ رشوت، جھوٹی تشہیر، جعل سازی، یا اجارہ داری جیسے طریقے وقتی فائدہ تو دے سکتے ہیں مگر یہ اعتماد اور انصاف کے اصولوں کو مجروح کر کے پورے تجارتی نظام کو کھوکھلا کر دیتے ہیں۔ اس کے برعکس، وہ ادارے جو اپنی ترقی کو اصول پسندی، سچائی اور باہمی احترام سے جوڑتے ہیں، دراصل مسابقت کو خیر و فلاح کی راہ پر ڈال دیتے ہیں۔ اخلاقی مسابقت ہی وہ قوت ہے جو منڈی کو استحکام، صارفین کو اطمینان، اور معاشرے کو پائیدار ترقی عطا کرتی ہے۔

اسلام نے مسابقت کی حدود کو نہایت متوازن انداز میں واضح کیا ہے تاکہ مقابلہ تعاون میں بدلے، اور مفاد پرستی انصاف کی راہ اختیار کرے۔ اسی پہلو کو نبی اکرم ﷺ نے اپنے ارشاداتِ مبارکہ میں نہایت حکیمانہ انداز میں بیان فرمایا ہے:

»لَا يَحِلُّ لِامْرِءٍ أَنْ يَبِيعَ عَلَى بَيْعِ أَخِيهِ وَلَا يَخْطُبَ عَلَى خِطْبَةِ أَخِيهِ« (صحیح مسلم، حدیث:1412)

یعنی: ''کسی شخص کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی کی بیع پر بیع کرے اور نہ اس کی منگنی پر منگنی کرے۔''

یہ ارشاد مقابلے کے اخلاقی دائرے کو واضح کرتا ہے جہاں عزت، انصاف اور دیانت بنیادی قدر کی حیثیت رکھتی ہے۔

حاصلِ کلام

یہ اصول صرف اخلاقی تعلیمات نہیں بل کہ عملی زندگی میں ایک کام یاب اور دیرپا کاروباری ماڈل کے لیے بنیادی ستون ہیں۔ دنیا کی وہ کمپنیاں جو معیار، دیانت اور شفافیت کو اپنی پالیسی کا حصہ بناتی ہیں وہی طویل المیعاد کام یابی حاصل کرتی ہیں۔ اس کے برعکس وہ کاروبار جو دھوکے، بدعنوانی اور ناانصافی کی بنیاد پر کھڑے ہوں، وہ جلد یا بہ دیر زوال کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یوں ثابت ہوتا ہے کہ **کاروباری اخلاقیات** نہ صرف دینی و اخلاقی فریضہ ہیں بل کہ پائیدار معیشت اور باوقار تمدن کی اساس بھی۔

4-کاروباری اخلاقیات کی بنیادیں

کاروباری اخلاقیات کی چند اہم بنیادیں درج ذیل ہیں:

4.1-مذہبی بنیادیں

کاروباری اخلاقیات کی سب سے پہلی اور مضبوط بنیاد **مذہب** ہے۔ مذہب انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر پہلو کو ضابطے میں لانے کی کوشش کرتا ہے اور کاروبار بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔

اسلام نے تجارت و معیشت کو نہ صرف حلال ذریعۂ معاش قرار دیا ہے بل کہ اس کے اصول و ضوابط بھی نہایت وضاحت کے ساتھ متعین کیے ہیں۔ قرآنِ مجید میں ارشاد ہے:

»يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ («سورۂ النساء: 29)

یعنی: ''اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقے سے مت کھاؤ، ہاں اگر باہمی رضا مندی سے تجارت ہو تو جائز ہے۔''

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ تجارت صرف اس وقت درست ہے جب وہ رضامندی، دیانت اور انصاف پر مبنی ہو۔

رسولِ اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

»التَّاجِرُ الصَّدُوقُ الْأَمِينُ مَعَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ(«جامع الترمذی، حدیث: 1209)

یعنی: ''سچا اور امانت دار تاجر انبیا، صدیقین اور شہدا کے ساتھ ہوگا۔''

یہی نہیں بل کہ دیگر مذاہب میں بھی کاروباری دیانت اور انصاف پر زور دیا گیا ہے۔

مثلاً:

- تورات میں صاف ہدایت ہے کہ ''تمھارے تھیلے میں دو طرح کے ترازو کے باٹ نہ ہوں، ایک بھاری اور ایک ہلکا۔ تمہارے گھر میں دو طرح کے پیمانے نہ ہوں، ایک بڑا اور ایک چھوٹا۔ تمہارے پاس پورا اور درست باٹ ہو، پورا اور درست پیمانہ ہو، کیونکہ جو لوگ ایسا کرتے ہیں، یعنی دھوکا دہی سے کام لیتے ہیں، وہ خداوند کے نزدیک مکروہ ہیں۔''
- ہے۔عیسائیت میں انجیل میں زر پرستی اور دھوکا دہی کی مذمت کی گئی ہے'': تم اللہ اور دولت دونوں کی بندگی نہیں کر سکتے''(انجیل متی 6:24)۔

الغرض مذہبی بنیادیں کاروباری اخلاقیات کو اس کی روح عطا کرتی ہیں اور تاجر کو یاد دلاتی ہیں کہ اس کا معاملہ صرف گاہک سے نہیں بل کہ اللہ رب العزت سے بھی ہے جو ہر قول و فعل کا نگہ بان ہے۔

4.2۔نفلسفیانہ بنیادیں

کاروباری اخلاقیات کی دوسری بڑی بنیاد وہ **فلسفیانہ افکار و نظریات** ہیں جو مختلف ادوار میں انسان نے عقل و دانش کی روشنی میں قائم کیے۔ اگرچہ مذہب نے اخلاقیات کا ایک بلند و برتر معیار متعین کیا لیکن انسانی فکر بھی ہمیشہ اخلاقی اصولوں کے سرچشمے کو پانے کی جستجو میں رہی۔

چناں چہ دنیا کے بڑے فلسفیوں نے تجارت اور معیشت کے اخلاقی دائرے پر اپنی آرا پیش کیں اور بعض کی آرا آج بھی جدید اقتصادیات اور کارپوریٹ اخلاقیات کی بنیادوں میں جلوہ گر ہیں۔

افلاطون (Plato) اپنی مشہور تصنیف The Republic میں عدل کو انسانی معاشرت اور ریاست کی اساس قرار دیتا ہے۔ اگرچہ افلاطون نے بہ راہِ راست تجارت کے اصولوں پر کوئی مستقل نظام پیش نہیں کیا لیکن اس کا تصورِ عدل کاروباری اخلاقیات کے لیے سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے نزدیک اگر ریاست میں عدل نہ ہو تو کسی بھی شعبے میں خواہ وہ تجارت ہو یا سیاست توازن باقی نہیں رہ سکتا۔

اسی طرح **ارسطو (Aristotle)** نے اپنی تحریروں میں "اعتدال (Golden Mean)" کا اصول پیش کیا جو اخلاقیات کا بنیادی ستون ہے۔ اس کے مطابق فضیلت دو انتہاؤں، زیادتی اور کمی، کے درمیان اعتدال کا نام ہے۔ یہی اصول معاشی اور تجارتی معاملات میں بھی درست رویہ متعین کرتا ہے۔

قرونِ وسطیٰ کے یورپی مفکر **تھامس اکویناس (Thomas Aquinas)** نے بھی کاروباری اخلاقیات پر مذہب اور عقل دونوں کی روشنی میں گفت گو کی اور واضح کیا کہ ناجائز منافع خوری، دھوکا اور سود لینا عدل کے خلاف ہے کیوں کہ یہ انسانی برابری اور خیر کے اصول کو مجروح کرتا ہے۔

جدید فلسفۂ اخلاق میں کانٹ کا نظریۂ فرض (Deontological Ethics) ایک بنیادی سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ Groundwork for the Metaphysics of Morals میں کہتا ہے کہ "انسان کو ہمیشہ ایسا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے جو تمام انسانیت کے لیے عمومی قانون بن سکے۔" اس اصول کا تقاضا ہے کہ کسی بھی شخص کے ساتھ برتاؤ اسے محض مفاد کا ذریعہ نہیں بل کہ ایک باعزت انسانی ہستی کے طور پر کیا جائے۔ یہی اصول جب کاروبار پر منطبق ہوتا ہے تو یہ تعلیم دیتا ہے کہ تاجر اور ادارے اپنے مفادات سے بالا ہو کر سچائی، دیانت اور انصاف پر مبنی رویہ اپنائیں، کیوں کہ یہی طرزِ عمل حقیقی اخلاقی برتری اور پائیدار اعتماد کی بنیاد بنتا ہے۔

یہ فلسفیانہ بنیادیں آج جدید قوانین، کارپوریٹ ضابطہ ہائے اخلاق اور عالمی تجارتی اداروں کی پالیسیوں میں مختلف صورتوں میں نمایاں نظر آتی ہیں۔ یوں مذہب کے ساتھ فلسفہ بھی کاروباری اخلاقیات کی فکری اساس فراہم کرتا رہا ہے۔

4.3- سماجی و ثقافتی بنیادیں

کاروباری اخلاقیات کی ایک اہم بنیاد وہ سماجی اور ثقافتی اقدار ہیں جو کسی معاشرے کی مجموعی فکر، روایات اور عرف سے تشکیل پاتی ہیں۔ انسانی تاریخ گواہ ہے کہ کوئی بھی تجارت یا معیشت اپنے گرد و پیش کی تہذیبی روایات اور ثقافتی اقدار سے الگ نہیں رہ سکتی۔

ہر معاشرے میں کچھ ایسے عرف اور اقدار جنم لیتے ہیں جو وقت کے ساتھ کاروباری اخلاقیات کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ مثلاً عربِ جاہلیت کے دور میں بھی بعض تجارتی روایات مستحسن سمجھی جاتی تھیں، جیسے مہمان نوازی میں سخاوت، وعدے کی پاس داری اور امانت میں خیانت نہ کرنا۔ رسولِ اکرم ﷺ نے ان اقدار کو مزید نکھارا اور شرعی اصولوں کے تابع کر دیا۔

اسی طرح ہر قوم اور تہذیب کے ہاں کچھ سماجی معیارات رائج ہوتے ہیں جن کی بنیاد پر کاروباری لین دین میں اچھے یا برے ہونے کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ برصغیر کی صدیوں پرانی منڈیوں میں ایک عام تاجر بھی اپنی ساکھ کو سب سے بڑی دولت سمجھتا تھا۔ اس کے نزدیک وعدہ خلافی اور جھوٹ تجارت کے زوال کا سبب تھے۔

یہی وجہ ہے کہ علمائے کرام نے تجارت کے معاملات میں **عرف (custom)** کو بھی ایک حد تک معتبر قرار دیا ہے، بہ شرطیکہ وہ شریعت کے اصولوں کے خلاف نہ جائے۔ چناں چہ آج بھی ہر علاقے کا ثقافتی پس منظر کاروباری اخلاقیات پر اثر انداز ہوتا ہے: کہیں ہنر مندی کی قدر کی جاتی ہے، کہیں وعدے کی پاس داری کو سرمایہ سمجھا جاتا ہے اور کہیں صارفین کے حقوق کو بنیادی اخلاقی تقاضا تصور کیا جاتا ہے۔

یہ سماجی و ثقافتی بنیادیں اس لیے اہم ہیں کہ یہ تجارت کو اس کی زمینی حقیقتوں سے جوڑ کر رکھتی ہیں اور اخلاقیات کو مقامی سطح پر زندہ رکھنے میں مدد دیتی ہیں۔

4.4- قانونی و آئینی بنیادیں

کاروباری اخلاقیات کی ایک مضبوط اور ناگزیر بنیاد وہ قانونی اور آئینی اصول ہیں جو ریاستیں اور عالمی ادارے کاروباری دنیا کے لیے متعین کرتے ہیں۔ شریعتِ مطہرہ میں بھی احکامِ تجارت محض اخلاقی نصیحت نہیں،

بل کہ باقاعدہ قانون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی تصور آج بین الاقوامی قوانین اور ضابطوں میں مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہے، جہاں اخلاقی اقدار کو قانونی فریم ورک کا حصہ بنایا جارہا ہے۔

اقوامِ متحدہ کے گلوبل کمپیکٹ (United Nations Global Compact) کے اصول نمبر 10 کے مطابق: ''کاروباری اداروں کو بدعنوانی کی ہر شکل، بشمول رشوت اور جبر، کے خلاف عمل کرنا چاہیے۔''

(UN Global Compact, Principle 10, 2004)

اسی طرح OECD کی اینٹی برائبیری کنونشن (1997) میں یہ تقاضا کیا گیا کہ

''غیر ملکی سرکاری عہدے دار کو کسی بھی مالی یا غیر مالی فائدے کی پیش کش یا وعدہ جرم تصور کیا جائے گا۔''

(OECD Convention on Combating Bribery, Article 1, 1997)

یہ عالمی قوانین اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ جدید دنیا میں اخلاقی اصول محض نظری مباحث نہیں رہے، بل کہ قانونی دائرے میں نافذ ہو کر اداروں کے طرزِ عمل کو منضبط کر رہے ہیں۔ اسلام نے صدیوں پہلے اسی سمت رہ نمائی دی تھی، جہاں قانون اور اخلاقیات دو الگ وجود نہیں، بل کہ عدلِ اجتماعی کے ایک ہی نظام کے دو پہلو ہیں۔

قانون وہ مضبوط ڈھانچا فراہم کرتا ہے جس کے تحت کاروباری معاملات شفافیت، دیانت داری اور انصاف کی بنیاد پر انجام دیے جا سکیں۔ اگر قانونی نظام کم زور ہو یا اس پر عمل درآمد میں غفلت برتی جائے تو کاروباری اخلاقیات محض ایک نعرہ بن کر رہ جاتی ہیں۔

اسی قانونی بنیاد پر جدید دنیا میں تجارت کے کئی اصول قائم ہیں:

- ہر معاہدے کو قانونی تحفظ حاصل ہے۔
- صارفین کے حقوق کے تحفظ کے قوانین موجود ہیں۔
- بددیانتی، دھوکادہی، اجارہ داری اور ناجائز منافع خوری کے خلاف ضابطے نافذ ہیں۔

عصرِ حاضر میں تجارتی ادارے اور کارپوریٹ کمپنیاں اپنے ضابطہ ہائے اخلاق کو ملکی قوانین اور بین الاقوامی اصولوں کے تابع بناتی ہیں تاکہ وہ قانون کے دائرے میں رہ کر اپنی سرگرمیاں انجام دے سکیں۔ یہ قانونی و آئینی بنیاد اس لیے ناگزیر ہے کہ اسی کے ذریعے کاروباری اخلاقیات کو عملی شکل اور مؤثر نفاذ حاصل ہوتا ہے۔

خود آزمائی

1. کاروباری اخلاقیات کے بنیادی تعارف کی روشنی میں بتائیے کہ انسانی زندگی میں اخلاقیات کی ضرورت خاص طور پر کاروباری میدان میں کیوں زیادہ نمایاں ہے؟
2. کاروباری اخلاقیات کے مفہوم اور دائرۂ کار پر غور کیجیے۔ آپ کے خیال میں یہ دائرہ صرف کاروباری لین دین تک محدود ہے یا ادارے کی مجموعی پالیسی اور طرزِ عمل پر بھی محیط ہے؟
3. اسلامی نقطۂ نظر سے کاروباری اخلاقیات کی بنیادیں کن اصولوں پر قائم ہیں؟ قرآنِ مجید اور سنتِ نبوی ﷺ سے کوئی دو مثالیں دیجیے۔
4. جدید مغربی مفکرین (جیسے ایڈم اسمتھ، پیٹر ڈرکر یا جان راولز) نے کاروباری اخلاقیات کے باب میں کون سے فکری تصورات پیش کیے؟ مختصراً بیان کیجیے۔
5. کاروباری اخلاقیات کے بنیادی اصول (مثلاً دیانت، عدل، شفافیت، خیر خواہی) میں سے کسی ایک کو منتخب کیجیے اور وضاحت کیجیے کہ عملی زندگی میں اسے قائم رکھنا کیوں دشوار ہوتا ہے؟
6. کاروباری اخلاقیات کی ضرورت و اہمیت کے تناظر میں غور کیجیے کہ اگر ایک معاشرہ اپنے تجارتی معاملات سے اخلاقیات کو الگ کر دے تو اس کے ممکنہ نتائج کیا ہوں گے؟

یونٹ:5

سیاسی اخلاقیات

مصنف: ڈاکٹر منشاطیب

نظرِ ثانی: ڈاکٹر حامد حماد

فہرست عنوانات

یونٹ:5 69

سیاسی اخلاقیات 69

مصنف:ڈاکٹر منشاطیب 69

نظرِ ثانی:ڈاکٹر حامد حماد 69

یونٹ کا تعارف 72

یونٹ کے مقاصد 72

1-سیاسی اخلاقیات: مفہوم اور دائرۂ کار 74

2-سیاسی اخلاقیات کے بنیادی اصول 75

2.1–انصاف 75

2.2-امانت اور ذمہ داری 76

2.3-سچائی اور شفاف طرزِ حکومت 77

2.4-عوامی مفاد 78

2.5-مساوات اور مواقع کی برابری 79

2.6-برداشت، رواداری اور اختلافِ رائے کا احترام 81

2.7تنازعات کا پُرامن حل 81

2.8قانون کی بالادستی 83

2.9احتساب 84

2.10 شوریٰ اور مشاورت 84
2.11 خدمتِ خلق اور فلاحِ عامہ 85
2.12 سیاسی اعتدال اور توازن 85
2.13 عوامی اعتماد اور قیادت کا کردار 86
2.14 امن و عدمِ تشدد 86
2.15 اجتماعی فلاح اور بین الاقوامی تعاون 87
خود آزمائی 88

یونٹ کا تعارف

سیاست دراصل انسانی اجتماع کے نظم وضبط کا نام ہے۔ جہاں کہیں انسان مل جل کر زندگی گزارتا ہے وہاں باہمی تعاون، عدل، نظم اور قیادت کی ضرورت ناگزیر ہو جاتی ہے۔ مگر سیاست کا اصل جوہر تبھی برقرار رہتا ہے جب وہ اخلاقی اصولوں سے وابستہ ہو۔ اگر اخلاقیات کو سیاست سے الگ کر دیا جائے تو وہ تدبیر کے بجائے فریب، قیادت کے بجائے اقتدار اور خدمت کے بجائے خود غرضی میں بدل جاتی ہے۔ چناں چہ اخلاق ہی وہ روح ہے جو سیاسی زندگی کو انسانیت کے شایانِ شان بناتی ہے ورنہ سیاست طاقت اور مفاد کی اندھی کش مکش بن کر رہ جاتی ہے۔

تاریخِ انسانی اس بات کی شاہد ہے کہ جن قوموں نے سیاست کو اصول اور کردار کی بنیاد پر استوار کیا وہ دیرپا امن و ترقی سے بہرہ مند ہوئیں اور جنھوں نے سیاست کو صرف اقتدار کی بازی گری سمجھا وہ زوال و انتشار کا شکار ہوئیں۔ جدید دنیا میں سیاست کے دائرے نے وسعت ضرور پائی ہے مگر اس کی اخلاقی سمت بری طرح بگڑ چکی ہے۔ اس یونٹ میں ہم سیاست کی فطری حقیقت، اس کے اخلاقی اصول، انحرافات کے اسباب اور موجودہ عالمی سیاست میں اخلاقی زوال کے مظاہر پر گفت گو کریں گے۔ ساتھ ہی یہ سمجھنے کی کوشش کی جائے گی کہ ایک باشعور شہری کی حیثیت سے انسان اپنی سیاسی ذمہ داریوں کو کس طرح شرافت، دیانت اور خدمت کے جذبے کے ساتھ انجام دے سکتا ہے تاکہ سیاست کا مقصد صرف اقتدار نہیں بل کہ انسانیت کی فلاح، عدل اور امنِ عالم کا قیام ثابت ہو۔

یونٹ کے مقاصد

امید ہے کہ اس یونٹ کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1. سیاست اور اخلاقیات کے باہمی تعلق کو آفاقی اور انسانی نقطۂ نظر سے سمجھ سکیں۔
2. اقتدار، خدمت اور ذمہ داری کے درمیان اخلاقی توازن کو پہچان سکیں۔

3. سیاسی اخلاقیات کے بنیادی اصول جیسے انصاف، امانت، سچائی، مساوات اور رواداری کو فکری طور پر واضح کر سکیں۔
4. طاقت اور اخلاق کے باہمی تعلق پر مختلف فلسفیانہ نقطہ ہائے نظر (مثلاً افلاطون، کانٹ، رالز وغیرہ) کا تنقیدی مطالعہ کر سکیں۔
5. جدید سیاسی نظاموں میں اخلاقی بحرانوں (جھوٹ، مفاد پرستی، عدمِ شفافیت، کرپشن) کا تجزیہ کر سکیں۔
6. اختلافِ رائے اور تنازعات کے پُرامن حل کی اخلاقی اہمیت کو عملی مثالوں کے ذریعے سمجھ سکیں۔
7. ایک شہری اور ووٹر کی حیثیت سے دیانت، شرافت اور خدمت کے اصولوں کو اپنی سیاسی ذمہ داریوں میں بہ روئے کار لا سکیں۔
8. عالمی سیاست میں اخلاقی اقدار کے زوال کے اثرات کا جائزہ لے کر اخلاقی قیادت کی ضرورت کا ادراک پیدا کر سکیں۔

1-سیاسی اخلاقیات: مفہوم اور دائرۂ کار

انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے تمدنی اور اجتماعی وجود رکھتا ہے۔ وہ اکیلا نہ جیا ہے نہ جی سکتا ہے۔ اس کی بقا، ارتقا اور صلاحیتوں کا اظہار اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب وہ اجتماع کی شکل میں زندگی گزارتا ہے۔ مگر جہاں اجتماع ہو وہاں نظم کی ضرورت بھی ناگزیر ہے، کیوں کہ نظم کے بغیر اجتماع انتشار میں بدل جاتا ہے۔ یہی نظم و ضبط جب شعوری اصولوں کے تحت قائم کیا جاتا ہے تو وہ **سیاست** کہلاتا ہے۔ اس معنی میں سیاست کسی طبقے کا پیشہ یا اقتدار کا کھیل نہیں، بل کہ انسانی زندگی کے اس پہلو کا نام ہے جو باہمی حقوق، انصاف اور تعاون پر مبنی ہو۔

سیاست کا اصل مقصد انسانوں کے درمیان عدل، امن اور توازن پیدا کرنا ہے۔ لیکن جب سیاست اخلاق سے خالی ہو جائے تو وہ انصاف کے بجائے جبر، اور خدمت کے بجائے خود غرضی میں بدل جاتی ہے۔ تاریخِ انسانی اس بات کی گواہ ہے کہ جن معاشروں نے سیاست کو اصول اور کردار کی بنیاد پر استوار کیا، وہ استحکام و ترقی سے بہرہ مند ہوئے، اور جنھوں نے اسے طاقت و مفاد کا ہتھیار بنایا، وہ زوال و انتشار میں ڈوب گئے۔

سیاسی اخلاقیات دراصل اسی توازن کی تلاش ہے؛ یعنی یہ علم اس بات کا جائزہ لیتا ہے کہ اقتدار اور اختیار کے معاملات میں کون سے اصول انسان کو ظلم، فریب اور مفاد پرستی سے محفوظ رکھتے ہیں۔ اس کا بنیادی سوال یہ ہے کہ طاقت کا استعمال کب جائز اور کب غیر اخلاقی ہو جاتا ہے؟ یہ علم اس امر کو واضح کرتا ہے کہ سیاست اگر اخلاق کی تابع رہے تو وہ انسانی خدمت کا وسیلہ ہے، اور اگر اخلاق سے آزاد ہو جائے تو انسان کے لیے عذاب بن جاتی ہے۔

فلسفیانہ اعتبار سے سیاسی اخلاقیات سیاست اور اخلاق کے باہمی رشتے کو سمجھنے کی کوشش ہے۔ افلاطون نے کہا تھا:

''ریاست اسی وقت عادل ہو سکتی ہے جب اس کے حکم ران فلسفی ہوں۔''

یعنی جن کے فیصلوں پر عقل، علم اور اخلاق غالب ہوں۔ جدید مفکرین نے بھی یہی نکتہ مختلف الفاظ میں پیش کیا ہے کہ سیاست کی بقا انصاف، دیانت اور شفافیت کے بغیر ممکن نہیں۔

عملی سطح پر سیاسی اخلاقیات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ یہ صرف حکم رانوں اور اداروں تک محدود نہیں رہتا بل کہ عام شہری کے رویّے، ووٹ، فیصلہ اور طرزِ شرکت بھی اس کے احکام میں شامل ہیں۔ ایک رہ نما کی امانت داری، ایک افسر کی غیر جانب داری، ایک ووٹر کا باخبر فیصلہ، اور ایک ریاست کی دیانت دار پالیسی، یہ سب سیاسی اخلاقیات کے مظاہر ہیں۔

چناں چہ سیاسی اخلاقیات دراصل طاقت کو خدمت اور اقتدار کو ذمہ داری میں بدلنے کا فن ہے۔ اس کا نصب العین یہ ہے کہ انسان اجتماعی زندگی میں ایسا نظام قائم کرے جو انصاف، شرافت اور انسانی وقار پر مبنی ہو۔ جب سیاست دان اور شہری دونوں یہ شعور حاصل کر لیں کہ اقتدار نہیں، خدمت اصل شرف ہے، تو سیاست انسانیت کا فخر بن جاتی ہے؛ ورنہ وہ مفاد، مکر اور کش مکش کا استعارہ رہ جاتی ہے۔

2-سیاسی اخلاقیات کے بنیادی اصول

کسی بھی سیاسی نظام کی پائیداری کا دار و مدار اس کے اخلاقی اصولوں پر ہوتا ہے۔ محض آئین، قانون یا ادارے انسانوں کو صالح سیاست کی ضمانت نہیں دے سکتے، جب تک ان کے اندر انصاف، امانت اور دیانت کا احساس زندہ نہ ہو۔ اخلاقیات وہ روح ہے جو سیاست کے جسم میں حرارت پیدا کرتی ہے اور طاقت کو خدمت میں ڈھال دیتی ہے۔ سیاسی اخلاقیات کے یہ اصول کسی خاص مذہب یا تہذیب کے پیدا کردہ نہیں، بل کہ انسانی تجربے کے نچوڑ اور فطری شعور کی آواز ہیں۔ انھی اصولوں پر ہر وہ ریاست اور قیادت قائم رہ سکتی ہے جو انسانیت کی بھلائی کو اپنی غرض پر مقدم رکھتی ہے۔ اس حصے میں ہم ان آفاقی اصولوں کا جائزہ لیں گے جو ہر منصف مزاج سیاست کے لیے رہ نما حیثیت رکھتے ہیں۔

2.1–انصاف

انصاف سیاسی اخلاقیات کا پہلا اور بنیادی اصول ہے۔ یہی وہ میزان ہے جس پر اقتدار، قانون اور قیادت کی پوری عمارت قائم رہتی ہے۔ انصاف کا مفہوم صرف عدالت یا سزا تک محدود نہیں، بل کہ انسانی تعلقات میں

توازن، مساوات اور حق تلفی سے اجتناب کا نام ہے۔ سیاست اگر انصاف سے خالی ہو جائے تو طاقت جبر بن جاتی ہے، اور اگر عدل اس کارہ نما بن جائے تو حکومت رحمت میں بدل جاتی ہے۔

فلسفیوں نے ہمیشہ سیاست کے اخلاقی جوہر کو انصاف ہی میں تلاش کیا ہے۔ افلاطون نے کہا کہ ''ریاست اسی وقت عادل ہو سکتی ہے جب اس کا ہر طبقہ اپنی ذمہ داری دیانت داری سے ادا کرے۔'' ارسطو کے نزدیک انصاف وہ صفت ہے جو فرد کو خود غرضی سے نکال کر اجتماعی خیر کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ جدید مفکرین، مثلاً رالز نے اسے انسانی معاشرت کی پہلی خوبی قرار دیا—— کہ جس سماج میں عدل نہ ہو، وہاں کسی اور فضیلت کی بقا ممکن نہیں۔

اسلامی تناظر میں بھی عدل اقتدار کا سب سے پہلا اخلاقی فریضہ ہے۔ قرآن کہتا ہے:

''اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ''(النساء:58)

یعنی اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل تک پہنچاؤ اور لوگوں کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔

یوں عدل وہ خمیر ہے جو انسانی فطرت میں ودیعت ہے، اور ہر منصف ریاست کا پہلا اخلاقی پیمانہ بھی۔ سیاست میں انصاف کا قیام دراصل اقتدار کو اخلاق کے تابع رکھنے کا نام ہے تاکہ حکومت طاقت کا نہیں، ضمیر کا مظہر بنے۔

2.2-امانت اور ذمہ داری

سیاسی اخلاقیات کا دوسرا اصول امانت اور ذمہ داری ہے۔

اقتدار، قیادت، ووٹ، اور فیصلہ؛ یہ سب دراصل امانتیں ہیں جو انسان کو اجتماعی اعتماد کے ساتھ سونپی جاتی ہیں۔ امانت کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے اختیار کو ذاتی مفاد کے لیے نہیں بل کہ اجتماعی بھلائی کے لیے استعمال کرے۔ جہاں یہ احساس ختم ہو جائے وہاں سیاست خدمت کے بجائے کاروبار بن جاتی ہے، اور قیادت اعتماد کے بجائے خوف کی علامت۔

امانت داری دراصل وہ اخلاقی ضابطہ ہے جو اقتدار کے استعمال میں حدود طے کرتا ہے۔ یہ اصول اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ سیاست دان، حکم ران، یا عام شہری سب اپنے اپنے دائرے میں دیانت، انصاف اور جواب دہی کے احساس کے ساتھ کردار ادا کریں۔ جدید سیاسی فلسفہ بھی یہ مانتا ہے کہ قیادت اگر اعتماد کھو دے تو ریاست کا اخلاقی وجود باقی نہیں رہتا۔ گاندھی نے کہا تھا کہ ''اقتدار کا پہلا امتحان یہ ہے کہ آدمی خود کو اس سے بڑا نہ سمجھے۔''

اسلامی تناظر میں امانت کا تصور سیاست میں ایک بنیادی قدر کی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

''إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنسَانُ'' (الأحزاب: 72)

یعنی ہم نے امانت کو آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا، سب نے اس سے انکار کیا، مگر انسان نے اسے اٹھالیا۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

''جب امانت ضائع کر دی جائے تو قیامت کا انتظار کرو۔'' (صحیح البخاری، حدیث 59)

یہ حدیث دراصل اس حقیقت کی نشان دہی کرتی ہے کہ اقتدار اور ذمہ داری کا تقدس اگر ختم ہو جائے تو پورا تمدن اخلاقی زوال میں گر جاتا ہے۔ سیاسی اخلاقیات میں امانت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر شخص اپنے اختیار کو **فرض** سمجھے، **اختیار** نہیں؛ اور ہر فیصلہ اس نیت سے کرے کہ وہ انسانوں کے حق میں خیر کا ذریعہ بنے۔

2.3- سچائی اور شفاف طرزِ حکومت

سیاست کی اخلاقی بنیاد سچائی ہے۔ سچ وہ قدر ہے جو انسان کے ضمیر کو جھوٹ، ریا اور مفاد کے پردوں سے آزاد کرتی ہے۔ جب سچائی سیاست سے رخصت ہو جاتی ہے تو عوامی اعتماد ٹوٹ جاتا ہے اور اقتدار محض فریب کا کھیل بن کر رہ جاتا ہے۔ سچ بولنا صرف ایک شخصی خوبی نہیں بل کہ قیادت کی اخلاقی ضرورت ہے۔ حکم ران اگر سچ کو چھپانے لگے یا غلط بیانی سے اپنی پالیسیوں کو جواز دینے لگے تو قوم کی فکری بنیادیں متزلزل ہو جاتی ہیں۔

شفاف طرزِ حکومت سچائی ہی کا اجتماعی اظہار ہے۔ شفافیت کا مطلب یہ ہے کہ ریاست کے فیصلے، قوانین، مالی امور اور منصوبے عوامی علم میں ہوں۔ کسی بھی جمہوری نظام میں اعتماد اسی وقت قائم ہوتا ہے جب شہریوں کو

یہ معلوم ہو کہ ان کے معاملات دیانت داری سے انجام پا رہے ہیں۔ جدید سیاسی مفکرین کا اتفاق ہے کہ شفافیت اقتدار کے استحکام کی ضمانت ہے کیوں کہ جہاں چھپاؤ ہو وہاں کرپشن پنپتی ہے اور جہاں جواب دہی ہو وہاں اصلاح کا دروازہ کھلا رہتا ہے۔

اسلامی اخلاقیات میں سچائی کو ایمان کا جزو قرار دیا گیا ہے۔ قرآن میں فرمایا گیا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (التوبہ: 119)

یعنی اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو۔

نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''سچائی نیکی کی طرف لے جاتی ہے اور نیکی جنت کی طرف؛ آدمی برابر سچ بولتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اللہ کے نزدیک صادق لکھ دیا جاتا ہے''۔ (صحیح البخاری، حدیث 6094)

سیاست میں سچائی کا تقاضا یہ ہے کہ حکومت اپنے اعمال، پالیسیوں اور بیانات میں واضح، دیانت دار اور جواب دہ ہو۔ ایسی حکومت ہی شفاف کہلا سکتی ہے جو عوام سے کچھ نہ چھپائے اور اپنے فیصلوں کے نتائج قبول کرنے کا حوصلہ رکھتی ہو۔

2.4-عوامی مفاد

سیاست کی اصل غایت شخصی مفاد نہیں بل کہ عوامی بھلائی ہے۔ اقتدار اگر ذاتی منفعت یا گروہی غلبے کا ذریعہ بن جائے تو وہ اپنی اخلاقی بنیاد کھو دیتا ہے۔ سیاسی اخلاقیات اس بات پر زور دیتی ہے کہ حکومت کا ہر فیصلہ اور ہر پالیسی **اجتماعی خیر** کو پیشِ نظر رکھ کر بنائی جائے۔ عوامی مفاد وہ میزان ہے جس سے کسی بھی نظامِ حکومت کی درستی یا بگاڑ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

فلسفیانہ سطح پر ارسطو نے سیاست کو ''فنِ خیرِ عام'' کہا ہے، یعنی ایسی تدبیر جو انسانوں کے لیے بھلائی اور آسایش کا سبب بنے۔ جدید جمہوری فکر بھی اسی اصول پر قائم ہے کہ اقتدار عوام کی امانت ہے اور اسے انھی کی خدمت کے لیے استعمال ہونا چاہیے۔ جہاں حکم ران ذاتی منفعت کا اسیر ہو، وہاں ظلم اور استحصال جنم لیتا ہے اور جہاں نیت خیر خواہی ہو، وہاں عدل اور ترقی کا فروغ ہوتا ہے۔

اسلامی اخلاقیات میں بھی عوامی مفاد کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ قرآن میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ''(المائدہ:2)

نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ و زیادتی پر تعاون نہ کرو۔

حدیثِ مبارکہ میں ہے:

''مَا مِنْ عَبْدٍ يَسْتَرْعِيهِ اللهُ رَعِيَّةً يَمُوتُ يَوْمَ يَمُوتُ وَهُوَ غَاشٌّ لِرَعِيَّتِهِ، إِلَّا حَرَّمَ اللهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ.''(صحیح بخاری، کتاب الاحکام)

یعنی جو شخص اللہ کی طرف سے کسی رعایا پر حاکم مقرر کیا جائے اور وہ ان کے لیے خیر خواہی نہ کرے یہاں تک کہ اسی حالت میں مر جائے تو اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی۔

یہ ارشاد واضح کرتا ہے کہ اقتدار کا مقصد رعایا پر غلبہ نہیں بل کہ ان کی خیر خواہی ہے۔ سیاست اسی وقت صالح بن سکتی ہے جب وہ عوام کی فلاح کو مقدم رکھے اور ظلم و مفاد پرستی سے دامن بچائے۔ حکومت اگر عدل، آسایش اور تحفظ کا ذریعہ بن جائے تو وہ اقتدار نہیں بل کہ عبادت بن جاتی ہے۔

2.5-مساوات اور مواقع کی برابری

انسانی معاشرت کا استحکام اس وقت ممکن ہے جب سب افراد کو ترقی، عزت اور انصاف کے مواقع یک ساں طور پر میسر ہوں۔ سیاست میں مساوات کا مطلب یہ نہیں کہ ہر شخص کو ہر چیز برابر ملے بل کہ یہ کہ ہر شہری کے ساتھ قانون، اداروں اور فیصلوں میں یک ساں سلوک کیا جائے۔ معاشرت میں امتیاز اگر طاقت، زبان، نسل یا دولت کی بنیاد پر کیا جائے تو یہ سیاست کی اخلاقی روح کو مجروح کر دیتا ہے۔

سیاسی اخلاقیات کا تقاضا ہے کہ حکومت اور ادارے سب کے لیے ایک جیسے مواقع فراہم کریں۔ شہری حقوق میں امتیاز دراصل اعتماد کے زوال کی علامت ہے۔ معاصر فلسفی جان رالز (John Rawls) نے اس اصول کو ''Fair Opportunity'' کے نام سے پیش کیا کہ کوئی سماج اس وقت عادل کہلا سکتا ہے جب وہ ہر فرد کو کام یابی کے یک ساں مواقع فراہم کرے۔ سیاست اگر چند مخصوص طبقات کے گرد سمٹ جائے تو وہ جمہوریت نہیں رہتی بل کہ اقتدار کا امتداد بن جاتی ہے۔

اسلامی اخلاقیات میں مساوات کو انسانیت کا فطری حق قرار دیا گیا ہے؛ قرآن مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ(الحجرات: 13)

''اے لوگو ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمھیں قوموں اور قبیلوں میں اس لیے بانٹا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔''

یہ آیت بتاتی ہے کہ برتری کا معیار نسب، رنگ یا دولت نہیں بل کہ کردار اور تقویٰ ہے۔ حدیثِ مبارکہ میں بھی اس اصول کو نہایت واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے:

عَنْ أَبِي نَضْرَةَ، عَنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ أَنَّهُ قَالَ: يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَلَا إِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ، وَإِنَّ أَبَاكُمْ وَاحِدٌ، أَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلَى أَعْجَمِيٍّ، وَلَا لِأَعْجَمِيٍّ عَلَى عَرَبِيٍّ، وَلَا لِأَحْمَرَ عَلَى أَسْوَدَ، وَلَا لِأَسْوَدَ عَلَى أَحْمَرَ، إِلَّا بِالتَّقْوَى(مسند أحمد، حديث 22978)

ترجمہ '' :اے لوگو تمھارا رب ایک ہے اور تمھارا باپ ایک ہے۔ کسی عربی کو کسی عجمی پر، نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر، نہ کسی گورے کو کسی کالے پر اور نہ کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت نہیں، سوائے تقویٰ کے۔''

یہی مساوات انسانی سیاست کا سب سے بلند اخلاقی اصول ہے۔ سیاست اگر برابری کے تصور کو زندہ رکھے تو وہ ظلم سے محفوظ رہتی ہے۔ جہاں قانون سب پر یک ساں لاگو ہو وہاں عوام کو امن اور نظام دونوں پر اعتماد حاصل رہتا ہے۔

2.6- برداشت، رواداری اور اختلافِ رائے کا احترام

انسانی سماج تنوع کا مظہر ہے۔ افراد کے خیالات، ذوق اور نظریات مختلف ہوتے ہیں۔ یہی اختلاف جب علم و فہم کے دائرے میں رہے تو ترقی اور فکری وسعت کا باعث بنتا ہے مگر جب ضد اور **تعصب میں** بدل جائے تو نفرت اور انتشار کو جنم دیتا ہے۔ اس لیے برداشت اور رواداری کسی بھی مہذب معاشرت کی بنیادی قدر ہے۔

سیاسی اخلاقیات میں رواداری کا مطلب یہ ہے کہ مخالف رائے کو برداشت کیا جائے اور اختلاف کو دشمنی نہ سمجھا جائے۔ جمہوری معاشرت میں مکالمہ، مشورہ اور دلیل کے ذریعے مسئلوں کا حل تلاش کیا جاتا ہے۔ جہاں اختلافِ رائے دبایا جائے وہاں فکری جمود پیدا ہوتا ہے اور سیاست طاقت کے تصادم میں بدل جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید فلسفی اختلاف کو عقل و ضمیر کی صحت کی علامت سمجھتے ہیں۔

اسلامی تناظر میں بھی اختلاف اور تنوع کو فطرت کا حصہ قرار دیا گیا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

''وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ''(ھود:118)

''اور اگر تیرا رب چاہتا تو سب انسانوں کو ایک ہی امت بنا دیتا مگر وہ ہمیشہ مختلف رہیں گے۔''

اختلاف کے وقت نرمی، حلم اور گفت گو کا رویہ اسلامی اخلاقیات کا خاصہ ہے۔ حدیثِ مبارکہ میں ہے:

إِنَّ الرِّفْقَ لَا يَكُونُ فِي شَيْءٍ إِلَّا زَانَهُ، وَلَا يُنْزَعُ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا شَانَهُ''(صحیح مسلم، حدیث2594)

''نرمی جس چیز میں بھی ہو اسے زینت بخشتی ہے اور جس چیز سے نکال لی جائے اسے عیب دار بنا دیتی ہے۔''

معلوم ہوا کہ معاشرتی یا سیاسی اختلاف میں نرمی اور گفت گو ہی وہ اخلاقی راستہ ہے جو تنازع کو تصادم سے بچاتا ہے۔ رواداری دراصل وہ خلق ہے جو اختلاف کو وسعتِ نظر میں بدل دیتا ہے اور معاشرے کو فکری بلوغت عطا کرتا ہے۔

2.7 تنازعات کا پُرامن حل

اختلاف انسانی فطرت کا حصہ ہے مگر تنازع اسی وقت جنم لیتا ہے جب اختلاف ضد، غصے یا طاقت کے مظاہرے میں بدل جائے۔ سیاسی اور سماجی زندگی میں تنازعات ناگزیر ہیں مگر ان کا حل اگر پُرامن طریقے سے تلاش نہ کیا جائے تو

وہ قوموں کو تباہی کے دہانے تک پہنچا دیتے ہیں۔ سیاسی اخلاقیات کا ایک اہم اصول یہ ہے کہ تنازعات کو گفت گو، مشاورت اور عدل کے ذریعے حل کیا جائے، نہ کہ انتقام، جبر یا طاقت کے بل پر۔

فکری اور سیاسی سطح پر امن کا مطلب کم زوری نہیں بل کہ اخلاقی بلندی ہے۔ جس معاشرے میں گفت گو کا دروازہ بند ہو جاتا ہے وہاں تلوار اور نفرت کی زبان بولتی ہے۔ مہذب سیاست کی بنیاد ہی اس اصول پر ہے کہ اختلاف کو دشمنی میں بدلنے سے پہلے سمجھنے اور سلجھانے کی کوشش کی جائے۔ افلاطون نے کہا تھا کہ ''جنگ عقل کی ناکامی ہے'' اور جدید فلسفیوں نے اسی خیال کو ''Conflict Resolution'' کی شکل میں پیش کیا جس کے مطابق معاشرتی تنازعات کو گفت گو، مصالحت اور انصاف کے ذریعے ختم کیا جانا چاہیے۔

اسلامی تعلیمات میں بھی تنازعات کے پُرامن حل کو بڑی اہمیت حاصل ہے؛ قرآنِ مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''وَإِن طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا. فَإِن بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللهِ. فَإِن فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا. إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ'' (الحجرات:9)

''اور اگر مومنوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرا دو؛ پھر اگر ان میں سے ایک دوسروں پر زیادتی کرے تو اس سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے، پھر اگر لوٹ آئے تو ان کے درمیان انصاف کے ساتھ صلح کراؤ، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

حدیثِ مبارکہ میں آیا ہے:

عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِأَفْضَلَ مِنْ دَرَجَةِ الصَّلَاةِ وَالصِّيَامِ وَالصَّدَقَةِ؟ قَالُوا: بَلَى يَا رَسُولَ اللهِ. قَالَ: إِصْلَاحُ ذَاتِ الْبَيْنِ. فَإِنَّ فَسَادَ ذَاتِ الْبَيْنِ هِيَ الْحَالِقَةُ (.سنن ابی داود، حدیث 4919)

ترجمہ '' : کیا میں تمھیں ایسی بات نہ بتاؤں جو نماز، روزے اور صدقے سے بھی افضل ہے؟ لوگوں کے درمیان صلح کرانا، کیوں کہ باہمی فساد وہ چیز ہے جو (نیکیوں کو) جڑ سے کاٹ دیتا ہے۔''

یہ تعلیم تنازع کے وقت جنگ نہیں بل کہ گفت گو اور مصالحت کی دعوت دیتی ہے۔ سیاسی اخلاقیات کا تقاضا یہ ہے کہ مخالفین کو دشمن نہ سمجھا جائے بل کہ فریقِ مکالمہ مان کر صلح و مفاہمت کے راستے تلاش کیے جائیں۔ جہاں صلح کی

نیت ہو وہاں امن ممکن ہے، اور جہاں ضد ہو وہاں کوئی انصاف باقی نہیں رہتا۔

2.8 قانون کی بالادستی

کسی بھی منصفانہ نظامِ سیاست کی بنیاد قانون کی بالادستی پر قائم ہوتی ہے۔ قانون وہ میزان ہے جو طاقت اور عدل کے درمیان توازن پیدا کرتا ہے۔ اگر قانون کم زور پر سخت اور طاقت ور پر نرم ہو تو وہ قانون نہیں رہتا بل کہ ظلم کا ہتھیار بن جاتا ہے۔

سیاسی اخلاقیات کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ کوئی شخص یا ادارہ قانون سے بالاتر نہیں۔ اقتدار کا جواز اسی وقت اخلاقی کہلا سکتا ہے جب حکم ران خود بھی ان قوانین کا پابند ہو جو عوام پر لاگو کیے جاتے ہیں۔ قانون کی بالادستی دراصل انصاف اور مساوات کی ضمانت ہے۔ یہ اصول شہریوں کے دلوں میں اعتماد پیدا کرتا ہے کہ ان کے حقوق محفوظ ہیں اور ان کے ساتھ کسی امتیاز کا خطرہ نہیں۔ جہاں قانون کم زور ہو وہاں ظلم طاقت بن جاتا ہے اور معاشرہ بداعتمادی کا شکار ہو جاتا ہے۔

جدید سیاسی نظریہ اسی لیے "Rule of Law" کو جمہوریت کی روح قرار دیتا ہے کہ ریاست کا کوئی عمل قانون سے بالاتر نہیں ہو سکتا۔

اسلامی اخلاقیات میں بھی قانون کی اطاعت کو ایمان اور تقویٰ کے ساتھ جوڑا گیا ہے؛ قرآن مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ" (النساء: 59)

"اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کی بھی جو تم میں سے صاحبِ اقتدار ہیں۔"

یہ آیت دراصل نظمِ اجتماعی کی اساس فراہم کرتی ہے کہ حکومت ہو یا رعایا، سب کو قانون کی حدود میں رہنا ہے۔ حدیثِ مبارکہ میں بھی نبی اکرم ﷺ نے عدل کے اس توازن کو واضح فرمایا:

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: إِنَّمَا أَهْلَكَ الَّذِينَ قَبْلَكُمْ أَنَّهُمْ كَانُوا إِذَا سَرَقَ فِيهِمُ الشَّرِيفُ تَرَكُوهُ، وَإِذَا سَرَقَ فِيهِمُ الضَّعِيفُ أَقَامُوا عَلَيْهِ الْحَدَّ، وَايْمُ اللهِ لَوْ أَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ يَدَهَا. (صحیح بخاری، کتاب الحدود، حدیث 6788)

"پچھلی قومیں اس لیے ہلاک ہوئیں کہ اگر ان میں کوئی معزز آدمی چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے اور اگر کوئی کم زور چوری کرتا تو اس پر حد قائم کرتے۔ قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر فاطمہ بنتِ محمد بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔"

یہ فرمان اس اصول کو واضح کرتا ہے کہ قانون سب پر یک ساں نافذ ہونا چاہیے۔ قانون کی بالادستی صرف نظمِ ریاست کا نہیں بل کہ اخلاقِ سیاست کا بھی معیار ہے۔ جہاں انصاف سب کے لیے یک ساں ہو وہاں ریاست مضبوط اور قوم باوقار ہوتی ہے۔

2.9 احتساب

احتساب سیاسی اخلاقیات کا وہ ذریعہ ہے جو اقتدار کو شفاف، جواب دہ اور محدود بناتا ہے۔ احتساب کا مطلب صرف سزا کا نظام نہیں بل کہ شفاف جانچ، ذمہ داری کا تقاضا اور عوام کے سامنے وضاحت ہے۔ جب حکم ران یا ادارے اپنے اعمال کے بارے میں جواب دہ ہوں گے تو فیصلے محتاط اور عوامی مفاد کے قریب ہوں گے۔ احتساب کے بغیر طاقت بے لگام ہو جاتی ہے اور انصاف کا نظام کم زور پڑ جاتا ہے۔ جدید انتظامی حکمت عملیوں میں احتساب کے میکانزم جیسے آڈٹ، پارلیمنٹری کمیٹیاں، عدالتی نظرِ ثانی اور میڈیا نگرانی اس لیے ضروری ہیں کہ یہ قوت کو کنٹرول میں رکھتے ہیں اور عوامی اعتماد کو یقینی بناتے ہیں۔

اسلامی تعلیم بھی قیادت کی جواب دہی پر زور دیتی ہے۔ نبیِ کریم ﷺ نے واضح فرمایا کہ ہر انسان اپنی ذمہ داری کا جواب دے گا اور ہر حکم ران اپنے ماتحتوں کے سلسلے میں جواب دہ ہے:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، فَالْإِمَامُ رَاعٍ وَهُوَ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ (صحيح البخاري، كتاب الأحكام)

ترجمہ ”: تم میں سے ہر ایک نگران ہے اور تم سب سے اپنے زیرِ نگرش لوگوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ امیر نگران ہے اور وہ اپنی رعایا کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔“

یہ نصیحت واضح کرتی ہے کہ سیاسی احتساب محض قانونی تقاضا نہیں بل کہ اخلاقی لازم بھی ہے۔ احتساب کا نظام اس وقت کام یاب ہوتا ہے جب وہ قانوناً مضبوط، ادارہ جاتی طور پر آزاد اور سماجی طور پر قابلِ قبول ہو؛ تبھی اقتدار خدمت کے تقاضے پر قائم رہتا ہے اور عوام کا اعتماد برقرار رہتا ہے۔

2.10 شوریٰ اور مشاورت

سیاسی اخلاقیات میں شوریٰ یعنی باہمی مشورہ، انصاف اور اجتماعی فیصلے کا بنیادی اصول ہے۔ کوئی بھی فرد خواہ کتنا ہی فہیم کیوں نہ ہو، اجتماعی عقل اور تجربے کا نعم البدل نہیں۔ مشاورت طاقت کے ارتکاز سے بچاتی اور فیصلوں کو اعتماد و توازن بخشتی ہے۔ جس سیاست میں مشورے کا دروازہ بند ہو جائے وہاں آمریت جنم لیتی ہے اور اختلاف کو دشمنی سمجھا

جاتا ہے۔

اسلام نے اجتماعی مشورے کو نظامِ سیاست کا اخلاقی جوہر قرار دیا ہے۔ قرآنِ مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ ''(الشوری:38)

''اور ان کے تمام معاملات باہمی مشورے سے طے پاتے ہیں۔''

اس سے یہ اصول واضح ہوتا ہے کہ سیاست میں مشاورت نہ صرف عقل وتدبیر کا تقاضا ہے بل کہ اخلاقی ذمہ داری بھی۔ جو قومیں اجتماعی فیصلے کی عادی ہوں وہ اختلاف کو بکھراؤ میں نہیں بل کہ بہتری میں بدل دیتی ہیں۔

2.11 خدمتِ خلق اور فلاحِ عامہ

سیاست کی سب سے بلند صورت وہ ہے جو اقتدار کو خدمت میں بدل دے۔ حکم ران اور رہ نما عوام کے خادم ہیں، ان کے مالک نہیں۔ فلاحِ عامہ کا مطلب ہے کہ ریاست تعلیم، صحت، انصاف، روزگار اور تحفظ جیسے بنیادی حقوق کو اپنی اولین ترجیح بنائے۔ اقتدار اگر عوام کی خدمت کے لیے استعمال نہ ہو تو وہ اخلاقی جواز کھو دیتا ہے۔

اسلامی اخلاقیات میں خدمت کو قیادت کی شرط قرار دیا گیا ہے۔ حدیثِ مبارکہ میں آیا ہے:

''سَيِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُهُمْ ''(.الجامع الصغیر للسیوطی، حدیث 5121)

ترجمہ '' : قوم کا سردار وہ ہے جو ان کا خادم ہو۔''

یہ ارشاد واضح کرتا ہے کہ قیادت دراصل خدمت کا نام ہے۔ سیاسی اخلاقیات کے اس اصول کا تقاضا ہے کہ اقتدار ذاتی نفع کا وسیلہ نہیں بل کہ عوامی راحت کا ذریعہ بنے۔ جہاں قیادت خدمت کو شعار بنالے وہاں انصاف اور اعتماد خود بہ خود قائم ہو جاتے ہیں۔

2.12 سیاسی اعتدال اور توازن

سیاست میں سب سے بڑی خرابی انتہا پسندی اور مفاد پرستی ہے۔ یہ رویے انصاف اور عقل دونوں کو زائل کر دیتے ہیں۔ سیاسی اخلاقیات اعتدال کی دعوت دیتی ہے، یعنی فیصلوں میں میانہ روی، طرزِ گفت گو میں نرمی، اور عمل میں توازن۔ اعتدال دراصل وہ خلق ہے جو انسان کو جوش کے بجائے ہوش سے فیصلہ کرنے کی تربیت دیتا ہے۔ قرآنِ مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا'' (البقرہ: 143)

''اور ہم نے تمھیں ایک درمیانی (اعتدال پسند) امت بنایا۔''

یہ آیت سیاست اور معاشرت دونوں کے لیے راہِ اعتدال کی ہدایت ہے۔ وہ قومیں جو جوش کے بجائے توازن کو اپناتی ہیں، پائیدار امن اور ترقی کی راہ پر گام زن رہتی ہیں۔ اعتدال سیاست کو انتقام کے بجائے اصلاح کا ذریعہ بنا دیتا ہے۔

2.13 عوامی اعتماد اور قیادت کا کردار

قیادت دراصل امانت ہے، منصب نہیں۔ قیادت کی سب سے بڑی اخلاقی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ قول و عمل میں یکسانی، وعدے میں سچائی، اور فیصلوں میں دیانت برقرار رکھے۔ اگر قائد اور عوام کے درمیان اعتماد ٹوٹ جائے تو ریاست کی بنیادیں متزلزل ہو جاتی ہیں۔ عوامی اعتماد وہ سرمایہ ہے جس کے بغیر کوئی حکومت دیرپا نہیں رہ سکتی۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''إِذَا وُسِّدَ الْأَمْرُ إِلَى غَيْرِ أَهْلِهِ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ'' (صحیح بخاری، حدیث 59)

ترجمہ '' : جب معاملات نااہل لوگوں کے سپرد کر دیے جائیں تو قیامت کا انتظار کرو۔''

اس سے قیادت کی اہلیت اور دیانت دونوں کو معیار قرار دیا گیا ہے۔

عوامی اعتماد اسی وقت قائم ہوتا ہے جب قیادت نیت میں خالص، عمل میں شفاف اور کردار میں سچّی ہو۔ سیاست میں اعتماد کی بقا دراصل قیادت کے اخلاقی معیار پر منحصر ہے، کیوں کہ عوام کردار سے زیادہ کچھ نہیں دیکھتے۔

2.14 امن و عدمِ تشدد

امن انسانی تمدن کی سب سے بڑی ضرورت اور سیاست کی سب سے بلند قدر ہے۔ تشدد خواہ زبان کا ہو، قلم کا یا ہتھیار کا، ہمیشہ انصاف کو کم زور اور انسانیت کو مجروح کرتا ہے۔ پائیدار سیاست وہی ہے جو طاقت کے بجائے عقل، گفت گو اور رواداری کے ذریعے مسائل حل کرے۔ امن صرف جنگ نہ ہونے کا نام نہیں بل کہ ایک ایسا ماحول ہے جس میں خوف کے بجائے اعتماد، نفرت کے بجائے خیر خواہی اور تصادم کے بجائے تعاون ہو۔

سیاسی اخلاقیات کا تقاضا ہے کہ اختلاف کو مکالمے سے سلجھایا جائے اور طاقت کا استعمال صرف انصاف کے قیام کے لیے ہو۔ وہ قیادت جو امن کے اصول پر کاربند رہتی ہے، اپنے مخالف کو دشمن نہیں بل کہ فریقِ گفت گو سمجھتی ہے۔ جدید سیاسی فلسفے میں عدمِ تشدد کو طاقت کا اخلاقی متبادل قرار دیا گیا ہے، کیوں کہ یہ دلوں کو فتح کرتا ہے، زمینوں کو نہیں۔

اسلامی تعلیمات میں امن و سلامتی کو انسانی فلاح کی بنیاد بتایا گیا ہے۔ قرآنِ مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''وَاللّٰہُ یَدْعُوٓا إِلَیٰ دَارِ السَّلَامِ وَیَھْدِی مَن یَشَآءُ إِلَیٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِیمٍ ''(یونس:25)

''اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے اور جسے چاہتا ہے سیدھی راہ دکھاتا ہے۔''

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ امن دراصل اللہ کی طرف بلانے کی علامت ہے؛ نبیِ کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

''اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ''(صحیح بخاری، حدیث 10)

ترجمہ '' : مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔''

یہ حدیث امن کو فرد کے اخلاق سے جوڑتی ہے کیوں کہ اجتماعی امن فرد کے کردار سے جنم لیتا ہے۔ سیاست میں امن کا مطلب ہے کہ اختلاف کے باوجود انسان دشمنی سے باز رہے اور طاقت کو ضبط کے تابع رکھے۔ عدمِ تشدد وہ اخلاقی بلندی ہے جو اقتدار کو انسانیت کے قریب اور ظلم سے دور رکھتی ہے۔

2.15 اجتماعی فلاح اور بین الاقوامی تعاون

انسانی سیاست کا دائرہ صرف قوم، نسل یا سرحد تک محدود نہیں۔ جدید دنیا میں انسانیت ایک مشترک وحدت بن چکی ہے، جس کے مسائل بھی اجتماعی ہیں اور ان کے حل بھی باہمی تعاون کے بغیر ممکن نہیں۔ سیاسی اخلاقیات کا تقاضا ہے کہ ریاستیں اور قیادتیں اپنے مفادات کے ساتھ ساتھ نوعِ انسانی کے مشترکہ خیر کی بھی فکر کریں۔ اجتماعی فلاح کا مطلب یہ ہے کہ انصاف، امن، علم، ماحول، معیشت اور ترقی کے مواقع پوری انسانیت کے لیے یک ساں ہوں۔

بین الاقوامی تعاون دراصل اخلاقی احساسِ اشتراک کا نام ہے—یعنی قومیں ایک دوسرے کے ساتھ مقابلے کے بجائے باہمی بھلائی میں شریک ہوں۔ طاقت ور اقوام کم زوروں کا استحصال نہ کریں بل کہ ترقی، عدل اور انسانی وقار کے لیے مل کر کام کریں۔ یہی وہ رویہ ہے جو عالمی سیاست کو جنگ و تسلط سے نکال کر امن و انصاف کی طرف لے جا سکتا ہے۔

قرآنِ مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ''(المائدہ:2)

''نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ و زیادتی پر تعاون نہ کرو۔''

یہ اصول صرف داخلی نہیں بل کہ عالمی سیاست پر بھی منطبق ہوتا ہے؛ حدیثِ مبارکہ میں نبیِ کریم ﷺ نے انسانی خیر خواہی کو مومن کی پہچان قرار دیا:

''اَلْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهٗ بَعْضًا''(صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، حدیث 481)

ترجمہ'': مومن دوسرے مومن کے لیے دیوار کی مانند ہے جس کے حصے ایک دوسرے کو مضبوط کرتے ہیں۔''

یہ تعلیم محض مذہبی نہیں بل کہ انسانی اور عالمی ہے۔ جب اقوام ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوں تو زمین فساد نہیں بل کہ امن کا مسکن بن جاتی ہے۔

اجتماعی فلاح اور بین الاقوامی تعاون سیاسی اخلاقیات کا آخری اور بلند ترین اصول ہے جو انسان کو مفاد کے دائرے سے نکال کر انسانیت کی خدمت کے آفاقی دائرے میں لے آتا ہے۔

خودآزمائی

1. سیاست اور اخلاق کے باہمی تعلق کو واضح کیجیے۔ اگر سیاست سے اخلاق الگ ہو جائے تو اس کے کیا نتائج پیدا ہوتے ہیں؟
2. انصاف اور قانون کی بالادستی کے اصول میں کیا تعلق ہے؟ اپنی رائے کی تائید میں کوئی تاریخی یا عملی مثال دیجیے۔
3. شوریٰ اور مشاورت کا اصول سیاسی نظم میں کیوں ناگزیر سمجھا جاتا ہے؟ اس کی معاصر اہمیت بیان کیجیے۔
4. سیاسی قیادت کے لیے امانت اور خدمت کو بنیادی شرط قرار دینے کی وجوہات تحریر کیجیے۔
5. تنازعات کے پُرامن حل اور عدمِ تشدد کے اصول جدید دنیا میں کس طرح ریاستوں کے تعلقات بہتر بنا سکتے ہیں؟
6. عالمی سطح پر اجتماعی فلاح اور بین الاقوامی تعاون کے اصول کو آپ کس حد تک سیاسی اخلاقیات کا تسلسل سمجھتے ہیں؟ وضاحت کیجیے۔

یونٹ:6

پیشہ ورانہ اخلاقیات

مصنف: ڈاکٹر محمود احمد

نظرِ ثانی: ڈاکٹر محمد افضل

فہرست عنوانات

یونٹ:6 89

پیشہ ورانہ اخلاقیات 89

مصنف: ڈاکٹر محمود احمد 89

نظرِ ثانی: ڈاکٹر محمد افضل 89

یونٹ کا تعارف 92

یونٹ کے مقاصد 92

1- پیشہ ورانہ اخلاقیات کا مفہوم اور دائرہ کار 94

2- پیشے کی فطری و سماجی بنیاد 94

3- فلسفیانہ و عقلی توضیح 95

4- پیشہ ورانہ اخلاقیات کے بنیادی اصول 96

4.1 دیانت (Honesty) 96

4.2 امانت و ذمہ داری (Integrity and Accountability) 97

4.3 عدل و انصاف (Justice and Fairness) 98

4.4 احترامِ انسانیت (Respect for Human Dignity) 100

4.5 خدمتِ خلق (Service Orientation) 101

4.6- رازداری (Confidentiality) 102

4.7- شفافیت (Transparency) 103

4.8- وفاداری و تعاون (Loyalty and Cooperation) 104

4.9- خوداحتسابی (Self-Discipline and Accountability) 105
4.10- پابندیِ وقت (Punctuality and Time Discipline) 106
4.11- معیارِ کارکردگی (Excellence and Competence) 107
خودآزمائی 108

یونٹ کا تعارف

پیشہ ورانہ اخلاقیات دراصل انسان کے کردار کا وہ پہلو ہے جو اس کے روزگار اور پیشے سے وابستہ ذمہ داریوں کو اخلاقی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ پیشہ محض روزی کمانے کا وسیلہ نہیں بل کہ ایک امانت ہے جس میں انسان کا ضمیر، اس کا علم اور اس کی سچائی آزمائے جاتے ہیں۔ کوئی معلم اگر اپنے شاگردوں کی ذہنی تربیت میں کوتاہی کرتا ہے یا کوئی تاجر اگر دیانت کو قربان کر دیتا ہے تو وہ صرف اپنا فرض نہیں چھوڑتا بل کہ انسانی معاشرے کے اخلاقی توازن کو بھی مجروح کرتا ہے۔ اسی لیے اسلام نے کسبِ حلال کو عبادت، امانت داری کو ایمان، اور خدمتِ خلق کو بندگی کا جوہر قرار دیا—یہی پیشہ ورانہ اخلاقیات کی روح ہے۔

انسانی تمدن کی تاریخ بتاتی ہے کہ کسی بھی معاشرے کی تعمیر و ترقی کا مدار صرف مہارت یا علم پر نہیں بل کہ اس علم کے اخلاقی استعمال پر ہے۔ آج جب پیشے محض منافع اور مفاد کی دوڑ بن گئے ہیں تو اخلاقی توازن کی بحالی انسانیت کی اجتماعی ضرورت بن گئی ہے۔ ایسے ماحول میں پیشہ ورانہ اخلاقیات کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ یہ یونٹ طلبہ کو اس شعور سے آراستہ کرے گا کہ پیشہ دراصل انسان کی اخلاقی اور سماجی ذمہ داریوں کی ایک مقدس صورت ہے۔ اس کے ذریعے وہ نہ صرف امانت و دیانت کے اصول سمجھ سکیں گے بل کہ اپنی عملی زندگی میں خدمتِ خلق، عدل اور اخلاص کے جذبات کو بھی زندہ رکھنا سیکھیں گے۔

یونٹ کے مقاصد

امید ہے کہ اس یونٹ کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1. پیشہ اور اخلاق کے باہمی تعلق کو انسانی اور اسلامی تناظر میں سمجھ سکیں اور یہ شعور حاصل کر لیں کہ پیشہ محض روزی کا ذریعہ نہیں بل کہ ایک اخلاقی و سماجی ذمہ داری ہے۔
2. پیشہ ورانہ دیانت، امانت اور عدل کی اس حیثیت کو جان سکیں جو فرد کے کردار اور معاشرتی اعتماد کی بنیاد بنتی ہے۔

3. اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کسبِ حلال، خدمتِ خلق اور احساسِ ذمہ داری کے اصولوں کو اپنی عملی زندگی میں برتنے کا طریقہ سمجھ سکیں۔
4. جدید پیشہ ورانہ زندگی میں پائے جانے والے اخلاقی تضادات جیسے بددیانتی، مفاد پرستی اور استحصال کے اسباب واثرات کا تنقیدی تجزیہ کر سکیں۔
5. مختلف پیشوں (تدریس، طب، تجارت، صحافت، قانون وغیرہ) میں اخلاقی ضابطوں کو اسلامی اصولوں کی روشنی میں متعین کر سکیں۔

1-پیشہ ورانہ اخلاقیات کا مفہوم اور دائرہ کار

انسانی زندگی کا ایک بڑا حصہ اُس کے پیشے سے عبارت ہے۔ آدمی جو کچھ کرتا ہے، جس محنت سے رزق حاصل کرتا ہے اور جس خدمت سے معاشرے میں اپنا حصہ ادا کرتا ہے وہی دراصل اس کی پیشہ ورانہ شناخت ہے۔ مگر اگر انسان کا کام محض ضرورت یا مجبوری کی بنا پر انجام پائے اور اس کے اندر اخلاقی روح کارفرما نہ ہو تو وہ ایک بے جان حرکت بن کر رہ جاتا ہے۔ اسلام نے پیشے کو صرف روزی کمانے کا ذریعہ نہیں ٹھہرایا بل کہ اسے انسان کی بندگی اور خدمتِ خلق کے دائرے میں شامل کیا ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جو پیشے کو محض "کام" سے بلند کر کے "کارِ خیر" بنا دیتا ہے۔

پیشہ ورانہ اخلاقیات دراصل ان اصولوں کا مجموعہ ہیں جو انسان کو اپنے پیشے میں امانت دار، دیانت پیشہ اور خدمت گزار بناتے ہیں۔ یہ اخلاقیات محض ضابطہ یا قانون نہیں بل کہ ایک اندرونی احساس ہیں جو ضمیر کو بیدار رکھتے ہیں۔ اسلام کے نزدیک اخلاقیات کی بنیاد خوفِ خدا اور آخرت کی جواب دہی پر ہے۔ جب انسان یہ سمجھ لیتا ہے کہ اس کی محنت کا ہر لمحہ اللہ کی نگرانی میں ہے تو وہ اپنے فرائض میں کوتاہی نہیں کرتا، اپنے منصب کو ذاتی مفاد کے لیے استعمال نہیں کرتا اور اپنی پیشہ ورانہ سرگرمیوں میں خیر و عدل کے تقاضوں کو مقدم رکھتا ہے۔ چناں چہ اسلام کا مقصد یہ نہیں کہ انسان محض ایک پیشہ اختیار کرے بل کہ یہ ہے کہ وہ اپنے ہر پیشے کو عبادت کا رنگ دے اور اس میں اخلاقی بلندی کا نمونہ بن کر ابھرے۔

2-پیشے کی فطری و سماجی بنیاد

انسان اپنی فطرت میں ایک محنت کش، کارفرما اور سماجی مخلوق ہے۔ اللہ نے اسے بیکار پیدا نہیں کیا بل کہ اس کے وجود کے ساتھ کام، خدمت اور عمل کی طلب رکھی ہے۔ قرآنِ مجید میں ارشاد ہے:

﴿وَأَنْ لَيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ﴾ (النجم: 39)

"اور یہ کہ انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کی اس نے کوشش کی۔"

یہ آیت دراصل انسانی زندگی کے محوری اصول کو بیان کرتی ہے۔ انسان اپنی کوشش اور عمل سے ہی نہ صرف اپنی روزی کماتا ہے بل کہ سماج میں مفید بننے کا حق ادا کرتا ہے۔ پیشہ اسی محنت کا منظم اور سماجی اظہار ہے۔ چوں کہ انسانوں میں فطری طور پر مختلف صلاحیتیں اور رجحانات رکھے گئے ہیں اس لیے مقصود یہ ہے کہ ہر فرد اپنی

استعداد کے مطابق معاشرتی تعمیر میں اپنا حصہ ڈالے۔ کوئی تدریس کے میدان میں اپنی خدمات پیش کرے، کوئی طب میں، کوئی فنِ تعمیر یا قانون میں—یہ سب اس اجتماعی نظامِ حیات کے اجزا ہیں جس کے بغیر تمدن وجود نہیں پاسکتا۔

اسلامی نقطۂ نظر سے پیشہ صرف ذاتی منفعت کا ذریعہ نہیں بل کہ ایک سماجی ذمہ داری ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

''مَا أَكَلَ أَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ خَيْرًا مِنْ أَنْ يَأْكُلَ مِنْ عَمَلِ يَدِهِ، وَإِنَّ نَبِيَّ اللهِ دَاوُدَ كَانَ يَأْكُلُ مِنْ عَمَلِ يَدِهِ'' (بخاری، حدیث: 2072)

''کسی نے کبھی اس سے بہتر کھانا نہیں کھایا کہ وہ اپنی محنت سے کھائے اور اللہ کے نبی داؤدؑ اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھاتے تھے۔''

یہی وہ تعلیم ہے جو پیشے کو عزت، شرافت اور روحانیت عطا کرتی ہے۔ اسلام میں کام کو عبادت کا درجہ اسی لیے دیا گیا کہ یہ انسان کو خود غرضی اور طفیلی زندگی سے بچاتا ہے اور اسے مفید رکنِ معاشرہ بناتا ہے۔ اس طرح پیشے کی فطری بنیاد **محنت** ہے اور سماجی بنیاد **خدمت**۔ انسان جب ان دونوں اصولوں کو جمع کر لیتا ہے تو اس کی پیشہ ورانہ زندگی اخلاقی توازن اور روحانی ارتقا کا مظہر بن جاتی ہے۔

3- فلسفیانہ و عقلی توضیح

اخلاقیات کا تعلق صرف مذہبی تعلیمات سے نہیں بل کہ یہ انسانی عقل و ضمیر کا بھی تقاضا ہے۔ ہر صاحبِ فکر انسان محسوس کرتا ہے کہ اگر پیشہ اخلاقی حدود سے آزاد ہو جائے تو معاشرہ توازن کھو بیٹھتا ہے۔ ارسطو نے عمل کی خیر و شر کا مدار نیت اور مقصد پر رکھا ہے۔ اس کے نزدیک بہترین زندگی وہ ہے جس میں انسان اپنے فرائض کو عدل اور فضیلت کے ساتھ انجام دے۔ یہی اصول پیشہ ورانہ زندگی پر بھی صادق آتا ہے کہ کام محض نتیجے یا فائدے کے لحاظ سے نہیں بل کہ اس کی نیت اور نفع رسانی کے پہلو سے جانچا جائے۔

کانٹ کے نزدیک اخلاق کا سرچشمہ "فرض" ہے یعنی انسان کو نیکی اس لیے نہیں کرنی چاہیے کہ اس سے فائدہ ہو بل کہ اس لیے کہ وہ اس کا فرض ہے۔ یہ تصور پیشہ ورانہ زندگی میں ایک اعلیٰ اخلاقی معیار قائم کرتا ہے جہاں سچائی اور امانت محض مفاد نہیں بل کہ ذمہ داری بن جاتے ہیں۔ جان اسٹورٹ مل نے اگرچہ افادیت کو اخلاق کی بنیاد قرار دیا مگر اس کی افادیت بھی انسان کی مجموعی بھلائی اور خوشی سے وابستہ تھی نہ کہ ذاتی مفاد سے۔

سائنسی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو پیشہ ورانہ اخلاقیات انسانی نفسیات کے توازن سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔ جو شخص اپنے کام میں دیانت دار ہوتا ہے اس کے اندر اطمینان، اعتماد اور تسکین پیدا ہوتی ہے جب کہ بددیانتی اور

استحصال سے پیدا ہونے والا اضطراب انسان کی نفسی اور اجتماعی صحت دونوں کو مجروح کرتا ہے۔ اس طرح فلسفہ اور سائنس دونوں کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اخلاق پیشے کی روح ہے اور اس کے بغیر کسی پیشے کی بنیاد دیر پا نہیں رہ سکتی۔

4- پیشہ ورانہ اخلاقیات کے بنیادی اصول

پیشہ ورانہ اخلاقیات کے یہ اصول دراصل وہ ستون ہیں جن پر انسانی معاشرے کا اعتماد، اداروں کی ساکھ اور فرد کے کردار کی مضبوطی قائم ہوتی ہے۔ یہ اصول کسی خاص پیشے تک محدود نہیں بل کہ ہر اُس خدمت، ہنر یا ذمہ داری پر لاگو ہوتے ہیں جو انسان اپنی محنت اور قابلیت کے ذریعے انجام دیتا ہے۔ دنیا کی تمام مہذب تہذیبیں اس بات پر متفق ہیں کہ کسی پیشے کی پائیداری صرف اس وقت ممکن ہے جب اس کی بنیاد سچائی، امانت، عدل اور خدمت کے رویوں پر ہو۔ اسلام نے ان ہی آفاقی اصولوں کو وحی کی روشنی میں اخلاقی و روحانی بلندی عطا کی اور انھیں ایمان، عبادت اور تقویٰ کا لازمی حصہ قرار دیا۔

4.1 دیانت (Honesty)

دیانت انسانی اخلاق کا وہ پہلو ہے جو صداقت، شفافیت اور باطنی خلوص سے عبارت ہے۔ دنیا کی تمام بڑی تہذیبوں اور فلسفیانہ روایتوں نے اسے کردار کی بنیاد قرار دیا ہے۔ سقراط کے نزدیک سچائی روح کی صفائی ہے اور افلاطون نے "جمہوریہ" میں لکھا کہ معاشرہ اسی وقت پائدار رہ سکتا ہے جب اس کے افراد اپنے کردار میں سچے ہوں۔ کانٹ کے نزدیک دیانت محض ایک خوبی نہیں بل کہ اخلاقی فرض ہے، یعنی انسان کو سچ بولنا اس لیے چاہیے کہ سچ بولنا اپنی ذات میں واجب ہے، نہ کہ کسی فائدے کے لیے۔ جدید عہد میں بھی پیشہ ورانہ اخلاقیات کے اصولوں میں سب سے پہلا اصول Honesty ہی ہے، جس کے بغیر اعتماد، ادارہ جاتی شفافیت اور سماجی بھروسہ قائم نہیں رہ سکتا۔ یہ ایک ایسا آفاقی اصول ہے جسے نہ مذہب کی قید ہے نہ زمانے کی۔

اسلام نے اسی آفاقی قدر کو وحی کی روشنی میں ایک بلند تر اخلاقی فریضہ بنا دیا۔ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ (الأنفال: 27)

یعنی "اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی خیانت نہ کرو اور نہ اپنی امانتوں میں خیانت کرو جب کہ تم جانتے ہو۔" یہ

آیت دراصل اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ دیانت صرف ایک سماجی ضابطہ نہیں بل کہ ایمان کا جز ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

''التَّاجِرُ الصَّدُوقُ الأَمِينُ مَعَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ''(سنن ترمذی، حدیث 1209)

"سچا اور امانت دار تاجر انبیا، صدیقین اور شہدا کے ساتھ ہو گا۔" اسلام کے نزدیک دیانت اس شعور کا نام ہے کہ انسان کا ہر قول و فعل اللہ کی نگرانی میں ہے۔ جو شخص یہ احساس اپنے دل میں رکھتا ہے وہ کسی معاملے میں فریب نہیں دیتا، اپنے پیشے میں غلط بیانی نہیں کرتا اور اپنے منصب کو ذاتی مفاد کے لیے استعمال نہیں کرتا۔ پیشہ ورانہ زندگی میں دیانت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے علم، اعداد و شمار، مشورے یا فیصلے میں کبھی سچائی سے انحراف نہ کرے۔ دیانت وہ صفت ہے جو ایک تاجر کو معتبر بناتی ہے، ایک استاد کو محبوب، ایک وکیل کو معتمد اور ایک افسر کو باوقار بناتی ہے۔ یہ محض ایک خوبی نہیں بل کہ پورے نظامِ اخلاق کی اساس ہے۔ دیانت دار انسان اپنے پیشے کو عبادت بنالیتا ہے اور خیانت کار اپنے علم و ہنر کو بھی گناہ کا ذریعہ بنا دیتا ہے۔

4.2 امانت و ذمہ داری (Integrity and Accountability)

امانت اور ذمہ داری وہ اوصاف ہیں جن پر ہر متمدن معاشرہ اور ہر اعلیٰ نظامِ اخلاق استوار ہے۔ تاریخِ فکر کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یونانی فلسفیوں سے لے کر جدید عہد کے مفکرین تک سب نے امانت کو کردار کی اساس اور اعتماد کا سرچشمہ قرار دیا۔ ارسطو نے کہا کہ انسان کی فضیلت اس میں ہے کہ وہ اپنے فرائض دیانت اور عدل کے ساتھ انجام دے، جب کہ کانٹ کے نزدیک امانت ایک اخلاقی فرض (Moral Duty) ہے، جو انسان کی اندرونی صداقت سے جنم لیتی ہے، نہ کہ کسی بیرونی انعام کے لالچ سے۔ جدید سماجی علوم میں بھی ذمہ داری (Accountability) کو قیادت، نظم و نسق، اور پیشہ ورانہ دیانت کا مرکزی وصف مانا گیا ہے۔ کسی ادارے کی مضبوطی یا زوال دراصل اس کے کارکنوں کے احساسِ امانت اور جواب دہی پر منحصر ہے۔ یہ ایک ایسا آفاقی اصول ہے جسے ہر تہذیب نے انسانی بھلائی کی بنیاد کے طور پر تسلیم کیا۔

اسلام نے اسی آفاقی اصول کو ایمان اور عبادت کے رشتے سے جوڑ کر ایک روحانی فریضہ بنا دیا۔ قرآنِ مجید میں فرمایا گیا:

﴿إِنَّ اللهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا﴾(النساء:58)

یعنی "اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل کے سپرد کرو۔"اس آیت میں امانت محض کسی چیز کی حفاظت نہیں بل کہ ذمہ داری کے پورے نظام کی علامت ہے۔ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

»كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ«(صحیح بخاری، حدیث 893)

"تم میں ہر شخص نگہبان ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔" یہ حدیث انسان کے ضمیر کو جھنجھوڑتی ہے کہ وہ اپنے اختیار کو ملکیت نہیں، امانت سمجھے، اور اپنے ہر عمل کے لیے خود کو اللہ کے حضور جواب دہ جانے۔

پیشہ ورانہ زندگی میں امانت اور ذمہ داری کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی اپنے فرائض پوری دیانت، وفاداری اور احتیاط کے ساتھ انجام دے۔ اسے جو اختیار دیا گیا ہے وہ اس کا ذاتی سرمایہ نہیں بل کہ ایک امانت ہے، جس کا غلط استعمال خیانت کے مترادف ہے، خواہ وہ ذاتی مفاد کی خاطر ہو یا غفلت کے باعث۔ یہی احساسِ جواب دہی انسان میں ضبطِ نفس اور خلوص پیدا کرتا ہے۔ ایک پیشہ ور جب یہ سمجھ لیتا ہے کہ اس کے ہر عمل کا حساب اللہ کے حضور ہونا ہے تو وہ اپنے فیصلوں میں انصاف، اپنے رویّے میں احتیاط اور اپنے عمل میں شفافیت اختیار کرتا ہے۔ یہی وہ صفت ہے جو ایک ملازم کو فرض شناس، ایک منتظم کو عدل پسند اور ایک عہدے دار کو باوقار بناتی ہے۔ اسلام کے نزدیک امانت محض کسی چیز کی حفاظت نہیں بل کہ ایک ہمہ گیر نظام کردار ہے، جس میں انسان اپنے تمام معاملات میں اللہ کی نگرانی محسوس کرتا ہے اور اپنے کام کو عبادت کا درجہ دیتا ہے۔

4.3 عدل وانصاف (Justice and Fairness)

انسانی تاریخ اگر کسی قدر پر متفق دکھائی دیتی ہے تو وہ عدل ہے۔ دنیا کی تمام تہذیبوں اور فلسفیانہ روایتوں نے عدل کو انسانی تمدن کی اساس قرار دیا ہے۔ افلاطون نے کہا کہ عدل وہ ہم آہنگی ہے جو فرد کے اندر اور ریاست کے نظام میں توازن پیدا کرتی ہے۔ ارسطو نے اسے تمام فضائل کی جڑ کہا، کیوں کہ اس کے بغیر کسی نیکی کی بقا ممکن نہیں۔ جدید دنیا کے مفکرین بھی اسے انسانی حقوق، قانون اور سماجی مساوات کا بنیادی ستون سمجھتے ہیں۔ جان رالز (John Rawls) کے نزدیک عدل دراصل منصفانہ برتاؤ (Fairness) کا نام ہے، یعنی ہر فرد کو وہی

حق ملے جس کا وہ مستحق ہے۔اس طرح عدل ایک ایسا آفاقی اصول ہے جو مذہب، رنگ یا زمانے کی قید سے بالاتر ہو کر انسانیت کی مشترکہ آواز بن گیا ہے۔

اسلام نے اسی آفاقی قدر کو ایمان اور عبادت کے مرکز میں رکھا ہے۔قرآنِ مجید میں فرمایا گیا:

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ﴾(النحل:90)

''بے شک اللہ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔''

اور ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ﴾(النساء:135)

''اے ایمان والو! عدل پر مضبوطی سے قائم رہو، اللہ کے لیے گواہی دو اگرچہ وہ تمھارے اپنے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔''

نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

»إِنَّ الْمُقْسِطِينَ عِنْدَ اللهِ عَلَىٰ مَنَابِرَ مِنْ نُورٍ، الَّذِينَ يَعْدِلُونَ فِي حُكْمِهِمْ وَأَهْلِيهِمْ وَمَا وُلُّوا «(صحیح مسلم، حدیث 1827)

''بے شک انصاف کرنے والے اللہ کے نزدیک نور کے منبروں پر ہوں گے، وہ جو اپنے فیصلوں اور معاملات میں عدل سے کام لیتے ہیں۔''

یہ آیات اور حدیث اس امر کو واضح کرتی ہیں کہ اسلام میں عدل محض قانونی تقاضا نہیں بل کہ روحانی اور اخلاقی فریضہ ہے۔ یہ انسان کے باطن میں ایک ایسا توازن پیدا کرتا ہے جو اس کے فیصلوں، تعلقات اور ذمہ داریوں میں جھلکتا ہے۔ پیشہ ورانہ زندگی میں عدل کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے فیصلوں، سفارشوں اور رویّوں میں کسی شخص یا گروہ کی طرف داری نہ کرے۔ کسی کو ذاتی تعلق یا مالی مفاد کی بنا پر ترجیح دینا ظلم ہے اور کسی اہل شخص کو محض اختلافِ رائے یا حسد کی وجہ سے محروم رکھنا ناانصافی ہے۔

عدل دراصل وہ قوت ہے جو کسی پیشے کو محض ذریعۂ معاش نہیں بل کہ ذریعۂ تزکیہ بنا دیتی ہے۔ ایک منصف مزاج انسان جب اپنے منصب کو اللہ کی امانت سمجھ کر فیصلے کرتا ہے تو اس کی پیشہ ورانہ ساکھ اس کے ایمان

کی شہادت بن جاتی ہے۔ یوں عدل محض قانون کا مطالبہ نہیں رہتا بل کہ دل کی گواہی اور ضمیر کی روشنی بن جاتا ہے۔

4.4 احترامِ انسانیت (Respect for Human Dignity)

انسان کی حرمت اور وقار ہر دور میں اخلاقی شعور کا مرکز رہا ہے۔ قدیم فلسفیوں نے انسانی فضیلت کی بنیاد اسی عزتِ نفس اور باطنی شرافت پر رکھی ہے۔ افلاطون نے کہا کہ انسان کا احترام اس کے عقل و شعور کا احترام ہے، اور اسٹوئک فلاسفہ کے نزدیک ہر انسان اس لیے قابلِ تکریم ہے کہ وہ عقلِ عام (Reason) میں شریک ہے۔ جدید دنیا نے بھی انسانی وقار کو اپنے اخلاقی اور قانونی نظام کا پہلا اصول مانا—اقوامِ متحدہ کے انسانی حقوق کے منشور کی ابتدا ہی اس جملے سے ہوتی ہے کہ ''تمام انسان آزاد اور عزت و حقوق میں برابر پیدا کیے گئے ہیں۔'' گویا احترامِ انسانیت ایک ایسی آفاقی قدر ہے جس پر دنیا کے تمام ضمیر متفق ہیں، اگرچہ ان کے ماخذ مختلف ہوں۔

اسلام نے اسی آفاقی قدر کو وحی کی روشنی میں تقدیس عطا کی۔ قرآنِ مجید نے بڑے واضح اور پر شکوہ انداز میں اعلان کیا:

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ﴾ (الإسراء: 70)

''اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی۔''

یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کی حرمت کسی طبقے، نسل یا مذہب کی بنیاد پر نہیں، بل کہ محض انسان ہونے کے سبب ہے۔ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

»(لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيرَنَا وَيُوَقِّرْ كَبِيرَنَا) «سنن ترمذی، حدیث 1921

''وہ ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور بڑوں کا احترام نہ کرے۔''

اسلامی اخلاقیات میں احترامِ انسانیت دراصل اس بات کا نام ہے کہ آدمی دوسرے انسان کو اُس کی پیدائشی عزت کے ساتھ برتاؤ کرے، چاہے وہ اس کا ہم مذہب ہو یا نہ ہو، اس کے مرتبے میں چھوٹا ہو یا بڑا۔

پیشہ ورانہ زندگی میں احترامِ انسانیت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے ساتھیوں، ماتحتوں اور عوام سے نرمی، شائستگی اور ہمدردی کے ساتھ پیش آئے۔ کسی کم زور پر رعب جمانا، اختلاف رکھنے والے کو حقیر سمجھنا یا عوام سے تحقیر آمیز لہجے میں گفت گو کرنا اخلاقی زوال کی علامت ہے۔ ایک ڈاکٹر جب مریض سے نرمی سے بات کرتا ہے، ایک استاد جب شاگرد کی خطا کو برداشت کرتا ہے، یا ایک افسر جب رعایا کے ساتھ انصاف سے پیش آتا ہے، تو دراصل وہ اپنے پیشے کو انسانی خدمت کا درجہ دے رہا ہوتا ہے۔ احترامِ انسانیت کا یہ جذبہ محض تعلقات تک محدود نہیں رہتا بل کہ یہ سماجی حساسیت میں ڈھل کر معاشرے کو مہذب، نرم دل اور عادل بنا دیتا ہے۔

4.5 خدمتِ خلق (Service Orientation)

انسانی تاریخ گواہ ہے کہ ہر وہ تمدن جو دوسروں کی بھلائی اور خدمت کے جذبے سے خالی ہو، دیر پا نہیں رہتا۔ تمام مذاہب، فلسفوں اور تہذیبوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ انسان کی اصل قدر اس کی خود غرضی میں نہیں بل کہ دوسروں کے لیے نفع رسانی میں ہے۔ ارسطو نے کہا کہ انسان فطرتاً سماجی (Social) مخلوق ہے اور اس کی فضیلت اسی وقت ظاہر ہوتی ہے جب وہ اپنی صلاحیتوں کو دوسروں کے فائدے میں صرف کرے۔ کنفیوشس نے بھی یہی تعلیم دی کہ "جس نے اپنے بھائی کے لیے وہ چاہا جو اپنے لیے چاہتا ہے، وہی حقیقی انسان ہے۔" جدید سماجی نظریات بھی اسی اصول پر قائم ہیں کہ کسی معاشرے کی بھلائی اس کے افراد کے احساسِ خدمت سے ناپی جاتی ہے۔ گویا خدمتِ خلق ایک ایسا آفاقی اصول ہے جو انسان کو اپنے وجود کے معنی سمجھاتا ہے۔

اسلام نے اس آفاقی قدر کو ایمان اور اخلاق کے دل میں جگہ دی۔ قرآنِ مجید نے فرمایا:

﴿وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى﴾ (المائدہ:2)

نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو۔

یہ تعلیم انسان کو فردیت کے خول سے نکال کر اجتماعیت کی وسعت میں داخل کرتی ہے۔ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

خَيْرُ النَّاسِ أَنْفَعُهُمْ لِلنَّاسِ «(المعجم الأوسط للطبرانی، حدیث 5937)

سب سے بہتر انسان وہ ہے جو لوگوں کے لیے سب سے زیادہ نفع رساں ہو۔"

اسلامی تصورِ پیشہ میں خدمتِ خلق محض ایک اخلاقی خوبی نہیں بل کہ پیشے کی روح ہے۔ مسلمان کے نزدیک کام کا مقصد صرف کمائی نہیں بل کہ اللہ کی رضا اور بندگانِ خدا کے لیے نفع رسانی ہے۔

پیشہ ورانہ زندگی میں خدمتِ خلق کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے پیشے کو معاشرے کی بھلائی اور سہولت کا ذریعہ سمجھے۔ ایک ڈاکٹر کا علاج محض پیشہ نہیں بل کہ عبادت ہے، ایک استاد کی تعلیم صرف روزگار نہیں بل کہ ایک امانت ہے، اور ایک سرکاری ملازم کی ذمہ داری صرف دفتر تک محدود نہیں بل کہ عوام کی سہولت تک پھیلی ہوئی ہے۔ جو شخص اس نیت سے کام کرتا ہے کہ اس کے عمل سے اللہ کے بندوں کو آسانی پہنچے، وہ اپنے دفتر، دکان یا ادارے کو عبادت گاہ بنا لیتا ہے۔ یہی احساس فرد میں ایثار، خلوص اور قربانی کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ پیشہ جب خدمت میں بدل جاتا ہے تو معاشرہ ایک زندہ، مہربان اور پُرامن نظام کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

4.6- رازداری (Confidentiality)

انسانی تاریخ کی تمام مہذب تہذیبوں نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ اعتماد، ہر تعلق اور ہر ادارے کی بنیاد ہے۔ اگر باہمی اعتماد ٹوٹ جائے تو کوئی بھی پیشہ، عدالت، یا معاشرہ قائم نہیں رہ سکتا۔ اسی اعتماد کا سب سے نازک مظہر **رازداری** ہے۔ افلاطون نے کہا تھا کہ ''حکمت وہ ہے جو زبان کو اس وقت خاموش رکھے جب بولنے سے خیر نہ ہو''، اور جدید پیشہ ورانہ دنیا میں یہی رازداری اخلاقی وقار کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ طب، قانون، نفسیات، بینکاری، یا انتظامی خدمات — سب کا کی بقاء اسی پر منحصر ہے کہ حساس معلومات محفوظ رہیں اور ان کا غلط استعمال نہ ہو۔

اسلامی اخلاقیات میں راز کی حفاظت کو ایمان کا حصہ قرار دیا گیا ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

''إِذَا حَدَّثَ الرَّجُلُ بِالْحَدِيثِ ثُمَّ الْتَفَتَ فَهِيَ أَمَانَةٌ'' (سنن أبي داود، حدیث: 4868)

''جب کوئی شخص تم سے کوئی بات کرے اور پھر اِدھر اُدھر دیکھے تو وہ بات امانت ہے۔''

یہ حدیث نہایت باریک نکتہ واضح کرتی ہے کہ محض کسی کے اندازِ گفتار سے بھی اگر رازداری کا اشارہ ملے تو اسے ظاہر کرنا خیانت ہے۔ اسلام میں خیانت صرف مال یا دولت کی نہیں، بل کہ کلام، اعتماد، معلومات، اور احساسات کی سطح تک پھیلی ہوئی ہے۔

پیشہ ورانہ زندگی میں رازداری کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی اپنے موکل، ادارے یا شریکِ کار سے متعلق معلومات کو اس وقت تک افشانہ کرے جب تک کوئی بڑی اخلاقی یا قانونی مجبوری پیش نہ آجائے۔ ایک ڈاکٹر کو مریض کے مرض اور علاج کے بارے میں، ایک وکیل کو اپنے موکل کے مقدمے کے بارے میں، اور ایک صحافی کو اپنے ذرائع کے بارے میں مکمل امانت دار ہونا چاہیے۔

رازداری کا تحفظ نہ صرف اعتماد کو مضبوط کرتا ہے بل کہ معاشرے میں اخلاقی وقار اور ادارہ جاتی شفافیت کو بھی برقرار رکھتا ہے۔ اس کے بغیر کسی بھی پیشے کی حرمت باقی نہیں رہ سکتی۔ جب انسان دوسروں کے بھروسے کو امانت سمجھ کر نبھاتا ہے تو وہ دراصل اپنے کردار کی تقدیس قائم کرتا ہے۔

4.7- شفافیت(Transparency)

تہذیبوں کی اخلاقی تاریخ میں **شفافیت** کو ہمیشہ صداقت اور اعتماد کی بنیاد سمجھا گیا ہے۔ انسانی ضمیر کی یہ روشنی عمل کے ہر گوشے کو منور کر دیتی ہے۔ سقراط کے نزدیک سچائی انسان کی روح کی غذا ہے، اور کانٹ کے نزدیک ''ایسا عمل جو سب پر ظاہر ہو سکے، وہی اخلاقی ہے۔'' جدید دنیا میں شفافیت کو ادارہ جاتی دیانت، عوامی اعتماد، اور اچھی حکمرانی (Good Governance) کی علامت مانا جاتا ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے شفافیت محض ایک اخلاقی خوبی نہیں، بل کہ ایمان کا عملی اظہار ہے۔ قرآنِ مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

''وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ''(البقرۃ:283)

''گواہی کو مت چھپاؤ، اور جو اسے چھپاتا ہے، اس کا دل گناہگار ہے۔''

یہ آیت بتاتی ہے کہ صداقت اور وضاحت ایمان دارانہ طرزِ عمل کے بنیادی اجزا ہیں۔ ایمان دار شخص اپنے قول و فعل، فیصلوں، اور معاملات میں کسی ابہام یا فریب کے لیے جگہ نہیں چھوڑتا۔

پیشہ ورانہ زندگی میں شفافیت کا تقاضا یہ ہے کہ فیصلے، لین دین، معاہدات، رپورٹیں اور گفت گو اس انداز سے انجام پائیں کہ ان میں کسی بدنیتی یا غلط فہمی کی گنجایش باقی نہ رہے۔ ادارے کا ہر فرد اپنے منصب، اختیارات اور نتائج سے واقف ہو، کیونکہ یہی آگہی اعتماد کی بنیاد بنتی ہے۔

اسلامی اخلاقیات میں سچائی صرف زبان کی نہیں، نیت اور طرزِ عمل کی بھی شرط ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''عَلَيْكُمْ بِالصِّدْقِ، فَإِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِي إِلَى الْبِرِّ، وَإِنَّ الْبِرَّ يَهْدِي إِلَى الْجَنَّةِ''

(صحیح البخاری، حدیث: 6094)

''سچائی کو لازم پکڑو کیوں کہ سچائی نیکی کی طرف لے جاتی ہے اور نیکی جنت کی طرف رہ نمائی کرتی ہے۔''

پس شفافیت وہ ستون ہے جس پر دیانت، انصاف، اور ذمہ داری کی عمارت قائم ہوتی ہے۔ جو ادارے اور افراد اس اصول پر کاربند رہتے ہیں، ان کے درمیان اعتماد، عزت، اور وقار پروان چڑھتا ہے۔ اس کے برعکس، ابہام اور فریب پر مبنی طرزِ عمل انسان کے ضمیر کو تاریک اور ادارے کے باطن کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔

جب کوئی پیشہ ور اپنے عمل کو وضاحت اور سچائی کی بنیاد پر استوار کرتا ہے تو وہ اپنے کردار کو نہ صرف معتبر بناتا ہے بل کہ اپنے پیشے کو روحانی وقار عطا کرتا ہے۔ اور یہی وہ روشنی ہے جس سے ایمان دار معاشرے تعمیر ہوتے ہیں۔

4.8- وفاداری و تعاون (Loyalty and Cooperation)

دنیا کی تمام مہذب تہذیبوں نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ کسی بھی ادارے یا پیشے کی پائیداری دو بنیادی اخلاقی ستونوں پر قائم ہوتی ہے —— وفاداری اور تعاون۔ یونانی فلسفی ارسطو نے کہا تھا کہ "ریاست کا استحکام اس وقت ممکن ہے جب شہریوں کے درمیان باہمی اعتماد اور خیر خواہی قائم ہو۔" جدید اخلاقی فلسفے میں بھی Loyalty کو تنظیمی نظم، اعتماد، اور اجتماعی ہدف کے حصول کے لیے ناگزیر سمجھا جاتا ہے۔ وفاداری کا مفہوم اندھی تقلید نہیں بل کہ باہمی اعتماد، خیر خواہی، اور دیانت پر مبنی وابستگی ہے۔

اسلام نے وفاداری کو ایمان کی شان قرار دیا ہے۔ قرآنِ مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

''يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ'' (المائدہ: 1)

''اے ایمان والو! اپنے عہدوں کو پورا کرو۔''

یہ آیت محض قانونی حکم نہیں بل کہ اخلاقی اصول بھی ہے۔ یہ ہمیں یاد دلاتی ہے کہ جو معاہدہ یا وابستگی انسان نے قبول کی ہے، اسے ایمان داری، خیر خواہی، اور استقامت کے ساتھ نبھانا لازم ہے۔

وفاداری کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے ادارے یا پیشے کے مفاد کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھائے، اپنی معلومات یا

پوزیشن کو ذاتی مفاد کے لیے استعمال نہ کرے، اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ خیر خواہی اور عزت کا سلوک کرے۔ اختلافِ رائے بھی اگر ہو تو تہذیب، احترام، اور نیتِ خیر کے ساتھ ہو، کیوں کہ اختلاف اگر ادب کے دائرے میں رہے تو ترقی کا ذریعہ بن جاتا ہے، اور اگر ضد و عناد میں بدل جائے تو بگاڑ کا سبب بنتا ہے۔

تعاون، وفاداری کا فطری ثمر ہے۔ انسان فطرتاً سماجی مخلوق ہے، اور اس کی ترقی تبھی ممکن ہے جب وہ دوسروں کے ساتھ مل کر خیر کے کام انجام دے۔ جدید ادارہ جاتی اخلاقیات میں **Teamwork** کو کامیابی کا سب سے بڑا ضامن سمجھا جاتا ہے۔ اسلام نے اس اصول کو صدیوں پہلے اپنے اخلاقی نظام میں مرکزی مقام دیا۔

رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

''**المؤمن للمؤمن كالبنيان يشدُّ بعضُه بعضًا**''(صحیح البخاری، حدیث:481)

''مومن دوسرے مومن کے لیے عمارت کی مانند ہے، جس کا ایک حصہ دوسرے حصے کو مضبوط کرتا ہے۔''

یہ حدیث پیشہ ورانہ زندگی کے لیے ایک آفاقی اصول ہے۔ ایک ادارہ جب تعاون اور خیر خواہی کے جذبے سے منظم ہوتا ہے، تو وہاں مقابلے کے بجائے شرکت، حسد کے بجائے حوصلہ افزائی، اور انانیت کے بجائے ایثار کی فضا پیدا ہوتی ہے۔

پیشہ ورانہ ماحول میں تعاون صرف کام بانٹنے یا مدد کرنے کا نام نہیں، بل کہ یہ ایک اخلاقی فضا ہے جس میں ہر فرد دوسرے کی عزت، رائے، اور خدمت کو وقعت دیتا ہے۔ ایسے ادارے محض مالی ترقی نہیں کرتے، بل کہ اخلاقی و انسانی سطح پر بھی نمو پاتے ہیں۔

اسلامی اخلاقیات کے مطابق جو شخص اپنے پیشے میں وفاداری اور تعاون کا مظاہرہ کرتا ہے، وہ دراصل اپنے ایمان اور کردار کی سچائی کو ظاہر کرتا ہے۔ یہی وہ روح ہے جو فرد کو باوقار، ادارے کو معتبر، اور معاشرے کو متحد بناتی ہے۔

4.9-خود احتسابی(Self-Disciplineand Accountability)

خود احتسابی دراصل انسان کی باطنی بیداری اور اخلاقی شعور کا مظہر ہے۔ یہ اس احساس کا نام ہے کہ آدمی اپنے اعمال، فیصلوں اور نیتوں کے لیے خود جواب دہ ہے۔ اگر اس کا ضمیر زندہ اور بیدار ہو تو وہ کسی بیرونی نگرانی کے بغیر بھی درست رویہ اختیار کرتا ہے۔ یہی وہ اندرونی قوت ہے جو انسان کو غلطی پر متنبہ کرتی اور اصلاح کی طرف متوجہ کرتی ہے۔

اسلام نے خود احتسابی کو ایمان کا جزو قرار دیا ہے۔ قرآنِ مجید میں ارشاد ہے:

''يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَا قَدَّمَتْ لِغَدٍ '' (الحشر:18)

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور ہر شخص دیکھے کہ اس نے کل کے لیے کیا بھیجا ہے۔''

یہ آیت انسان کو اپنے اعمال کا محاسبہ کرنے کی دعوت دیتی ہے تاکہ وہ کل کے انجام سے غافل نہ رہے۔ پیشہ ورانہ زندگی میں خود احتسابی کا ظہور اس وقت ہوتا ہے جب انسان اپنے کام، رویے اور فیصلوں کا خود جائزہ لے۔ اگر وہ غلطی کرے تو اسے تسلیم کرے، اصلاح کی کوشش کرے اور آئندہ کے لیے بہتر راہ اختیار کرے۔

رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

''الْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ'' (سنن الترمذی، حدیث: 2459)

''عاقل وہ ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ کرے اور موت کے بعد کی زندگی کے لیے عمل کرے۔''

یہ حدیث اس اصول کی بنیاد ہے کہ اصل دانائی محاسبۂ نفس میں مضمر ہے۔ جو شخص اپنے اندر یہ عادت پیدا کر لے، وہ اپنے پیشے میں بدعنوانی، کوتاہی اور غفلت سے محفوظ رہتا ہے۔

اداروں میں بھی خود احتسابی کا رواج ضروری ہے۔ جب تنظیمیں اپنے فیصلوں، منصوبوں اور کارکردگی کا جائزہ لیتی ہیں تو ان میں شفافیت، دیانت اور معیار خود بخود پروان چڑھتے ہیں۔

4.10-پابندیِ وقت (Punctuality and Time Discipline)

پابندیِ وقت دراصل انسان کی منظم سوچ اور اخلاقی ذمہ داری کا مظہر ہے۔ وقت کی قدر کرنا صرف انتظامی نہیں بل کہ اخلاقی رویہ ہے کیوں کہ جو شخص وقت کی پابندی کرتا ہے وہ دوسروں کے حق اور اعتماد کا احترام کرتا ہے۔ انسانی زندگی کا ہر لمحہ قیمتی سرمایہ ہے۔ جو وقت ضائع کرتا ہے وہ دراصل اپنی صلاحیت، موقع اور امانت کو ضائع کرتا ہے۔ اسی لیے کام یاب پیشہ ور وہ ہے جو اپنے فرائض کو وقت پر اور بہتر طریقے سے انجام دیتا ہے۔

اسلام میں وقت کی اہمیت پر غیر معمولی زور دیا گیا ہے۔ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے:

''وَالْعَصْرِ ۝ إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ'' (العصر: 1-2)

''زمانے کی قسم! بے شک انسان نقصان میں ہے۔''

یہ آیت انسان کو متنبہ کرتی ہے کہ وقت کا زیاں دراصل زندگی کا نقصان ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

''نِعْمَتَانِ مَغْبُونٌ فِيهِمَا كَثِيرٌ مِنَ النَّاسِ: الصِّحَّةُ وَالْفَرَاغُ''

(صحیح البخاری، حدیث: 6412'')

دو نعمتیں ایسی ہیں جن میں بہت سے لوگ خسارے میں ہیں: صحت اور فراغت۔''

پیشہ ورانہ زندگی میں وقت کی پابندی تنظیمی نظم وضبط اور اعتماد کی بنیاد ہے۔ اساتذہ، ڈاکٹر، وکیل یا سرکاری ملازم ـــــ سب کے لیے وقت پر کام انجام دینا دیانت داری اور احترامِ انسانیت کی علامت ہے۔

جو شخص وقت کی قدر کرتا ہے وہ دراصل اپنے عہد، قول اور ذمہ داری کو پورا کرتا ہے، اور یہی پیشہ ورانہ اخلاق کا جوہر ہے۔

4.11-معیارِ کارکردگی(Excellence and Competence)

معیارِ کارکردگی سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنے کام میں بہترین کارکردگی اور پیشہ ورانہ مہارت کا مظاہرہ کرے۔ یہ رویہ صرف فنی قابلیت نہیں بل کہ اخلاقی عزم کا اظہار ہے کیوں کہ اچھا کام کرنا اور اپنی ذمہ داری کو کمال تک پہنچانا دراصل نیکی کا عمل ہے۔

انسانی تاریخ کی تمام تہذیبوں نے کام میں حسن اور کمال کو اخلاقی قدر کے طور پر تسلیم کیا ہے۔ ارسطو نے فضیلت (Virtue) کو انسانی کردار کی معراج قرار دیا، اور کانٹ کے نزدیک نیکی وہ ہے جو فرض کے جذبے سے انجام پائے، نہ کہ محض فائدے کے لیے۔ اسی طرح جدید فلسفۂ اخلاق میں بھی ''پیشہ ورانہ معیار'' کو محض تکنیکی کمال نہیں بل کہ انسان کی باطنی دیانت اور ذمہ داری کا مظہر سمجھا گیا ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے معیارِ کارکردگی کی بنیاد احسان پر ہے۔ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ '' (السجدہ:7)

''اللہ وہ ہے جس نے ہر چیز کو بہترین انداز میں پیدا کیا۔''

یہ آیت ہمیں سکھاتی ہے کہ حسن اور کمال، خالقِ کائنات کی صفت ہے، اور بندے کے لیے لازم ہے کہ اپنے عمل میں حسن پیدا کرے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

''إِنَّ اللهَ يُحِبُّ إِذَا عَمِلَ أَحَدُكُمْ عَمَلًا أَنْ يُتْقِنَهُ '' (المعجم الأوسط للطبرانی، حدیث:8932)

''اللہ پسند کرتا ہے کہ جب تم میں سے کوئی کام کرے تو اسے بہترین طریقے سے کرے۔''

پیشہ ورانہ زندگی میں معیارِ کارکردگی کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے علم و فن کو بہتر بنائے، اپنے ہنر میں نکھار لائے، اور اپنی ذمہ داری کو پورے خلوص کے ساتھ انجام دے۔ یہ رویہ ترقی، اعتماد اور کامیابی کی ضمانت بنتا ہے۔

اداروں کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ معیارِ کارکردگی کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے تربیت، نگرانی، اور کارکردگی کے جائزے (Performance Evaluation) کے مؤثر نظام کو رائج کریں۔

اسلامی تعلیم ہمیں یہ اصول عطا کرتی ہے کہ ہر کام "احسن" انداز میں انجام پائے؛ یعنی نیت خالص ہو، عمل درست ہو، اور نتیجہ خیر پر مبنی ہو۔ یہی معیار ایک پیشہ ور کو محض ماہر نہیں بل کہ صالح انسان بناتا ہے۔

خود آزمائی

1. پیشہ ورانہ اخلاقیات سے کیا مراد ہے؟ اپنے الفاظ میں بیان کیجیے اور کسی ایک معتبر ماخذ سے تعریف بھی درج کیجیے۔
2. قرآن و سنت کی روشنی میں رزقِ حلال اور امانت داری کی تعلیمات پیشہ ورانہ زندگی پر کیسے اثر انداز ہوتی ہیں؟ وضاحت کیجیے۔
3. پیشہ ورانہ دیانت اور شفافیت کے درمیان کیا تعلق ہے؟ عملی مثال کے ساتھ وضاحت کیجیے۔
4. جدید معاشی و تنظیمی ماحول میں پیشہ ورانہ اخلاقیات کو درپیش دو بڑے چیلنجز بیان کیجیے اور ان کے ممکنہ حل تجویز کیجیے۔
5. "خود احتسابی" اور "پابندیِ وقت" کس طرح ایک کام یاب پیشہ ور کی شخصیت تشکیل دیتے ہیں؟ مختصر تبصرہ کیجیے۔
6. معیارِ کارکردگی (Excellence) کا تصور پیشہ ورانہ کام یابی کے لیے کیوں ناگزیر ہے؟ اسلامی نقطۂ نظر سے وضاحت کیجیے۔
7. کسی ایک پیشے (مثلاً طب، تعلیم، تجارت، یا صحافت) کا انتخاب کیجیے اور اس کے لیے ایک مختصر اخلاقی ضابطہ (Code of Ethics) تجویز کیجیے۔

یونٹ:7

معاشرتی حقوق وفرائض

مصنف: ڈاکٹر منشاطیب

نظرِ ثانی: ڈاکٹر محمد افضل

فہرست عنوانات

یونٹ:7 109

معاشرتی حقوق وفرائض 109

مصنف:ڈاکٹر منشاطیب 109

نظرِثانی:ڈاکٹر محمد افضل 109

یونٹ کا تعارف 112

یونٹ کے مقاصد 113

1-معاشرتی حقوق وفرائض: معنی ومفہوم 114

2-بنیادی معاشرتی حقوق 115

2.2حقِ عزت وحرمتِ انسان 117

2.3حقِ مساوات وعدل 118

2.4-حقِ تعلیم وتربیت 119

2.5-حقِ امداد وتعاون 120

2.6-حقِ آزادی وعدل 122

2.7-صحت مند ماحول کا حق 123

2.8اظہارِ رائے اور شمولیتِ اجتماعی کا حق 124

3- معاشرتی فرائض 125

3.1احترامِ انسانیت اور حسنِ سلوک 126

3.2عدل وانصاف کا قیام 127
3.3-نیکی اور بھلائی میں باہمی تعاون 129
3.4-اصلاحِ معاشرہ اور اخلاقی شعور کی ترویج 130
3.5معاشرتی خدمت اور فلاحی جذبہ 131
3.6-ماحولیاتی تحفظ 133
4-جدید معاشرتی تناظر 134
خود آزمائی..... 136

یونٹ کا تعارف

انسان فطرتاً ایک سماجی وجود رکھتا ہے۔ وہ نہ تنہا جی سکتا ہے نہ اپنی صلاحیتوں کو پوری طرح بہ روے کار لا سکتا ہے۔ یہی فطری میلان ہے جو انسان کو دوسروں کے ساتھ جڑنے، تعاون کرنے اور باہمی تعلقات قائم کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ اسی سے معاشرت جنم لیتی ہے جو انسانی تہذیب کی بنیاد اور اس کے حسن کا مظہر ہے۔ معاشرت دراصل باہمی حقوق، فرائض اور ذمہ داریوں کا وہ جال ہے جس کے بغیر انسانی زندگی انتشار اور خود غرضی کا شکار ہو جاتی ہے۔

فرد کی شخصیت بھی اسی وقت نکھرتی ہے جب وہ دوسروں کے حقوق کو پہچانتا اور ان کی بھلائی کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ معاشرتی زندگی کا حسن اسی میں پوشیدہ ہے کہ انسان اپنے گرد و پیش کے لوگوں کے ساتھ عدل، خیر خواہی، احترام اور ایثار کے رویے اختیار کرے۔

اسلام نے معاشرت کو محض ایک سماجی ضرورت نہیں بل کہ ایک ایسی اخلاقی ذمہ داری کے طور پر پیش کیا ہے جو انسان کی شرافتِ فطرت سے پھوٹتی ہے۔ یہاں فرد اور معاشرہ دو الگ دائرے نہیں بل کہ ایک ہی اخلاقی نظام کے دو رُخ ہیں۔ حقوق اور فرائض کا توازن اسی نظام کی روح ہے۔ اگر ہر فرد اپنے فرائض ادا کرے تو سب کے حقوق خود بہ خود محفوظ ہو جاتے ہیں۔

یہ یونٹ اسی بنیادی تعلق کو سمجھنے کی کوشش ہے کہ انسانی معاشرت کس طرح اخلاقی اصولوں پر قائم رہتی ہے، فرد کی ذمہ داری کہاں سے شروع ہوتی اور معاشرتی انصاف کہاں تک پھیلتا ہے۔ ساتھ ہی ہم جدید دنیا کے معاشرتی بحرانوں، خود غرضی، عدمِ برداشت، طبقاتی تفریق اور ماحولیاتی بگاڑ کا تنقیدی جائزہ بھی لیں گے تاکہ طلبہ میں ایک متوازن، بامقصد اور ذمہ دار معاشرتی شعور پروان چڑھے۔

یونٹ کے مقاصد

امید ہے کہ اس یونٹ کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1. انسانی فطرت میں موجود اجتماعی میلان اور معاشرتی زندگی کی ناگزیر ضرورت کو شعوری طور پر سمجھ سکیں۔
2. حق اور فرض کے باہمی تعلق کو اخلاقی و سماجی تناظر میں واضح کر سکیں۔
3. معاشرتی حقوق جیسے زندگی، عزت، تعلیم، صحت مند ماحول اور باہمی تعاون کو ایک مربوط نظام کے طور پر پہچان سکیں۔
4. فرد کی معاشرتی ذمہ داریوں، مثلاً احترامِ انسانیت، عدل، خیر خواہی اور ماحولیاتی تحفظ کو عملی سطح پر سمجھ سکیں۔
5. اسلامی تعلیمات میں حقوق و فرائض کے توازن کو ایک آفاقی اخلاقی نظام کی صورت میں دریافت کر سکیں۔
6. تاریخی نمونوں مواخاتِ مدینہ، خطبۂ حجۃ الوداع، اور خلفاے راشدین کے طرزِ حکم رانی کو موجودہ معاشرتی زندگی سے جوڑ کر ان کی عملی معنویت سمجھ سکیں۔
7. جدید معاشرتی چیلنجز جیسے خود غرضی، عدم برداشت، طبقاتی فرق اور ماحولیاتی بگاڑ کا تجزیہ کر سکیں۔
8. اپنی روزمرہ زندگی میں معاشرتی ہم آہنگی، رضاکارانہ خدمت اور شہری شعور کے عملی رویے اپنانے کی کوشش کریں۔

1-معاشرتی حقوق وفرائض: معنی ومفہوم

انسانی تاریخ کے آغاز سے لے کر آج تک معاشرتی زندگی کی بقاوارتقا باہمی حقوق وفرائض کے ایک نازک توازن پر قائم رہے ہیں۔ ہر دور کے مفکرین نے اس توازن کو انسانی تہذیب کی بنیاد قرار دیا ہے۔ افلاطون نے ''نظمِ شہر'' کو عدل پر قائم بتایا، ارسطو نے انسان کو'' مدنی الطبع'' کہا، جب کہ جدید عمرانی فکر، چاہے وہ روسو کا "سوشل کنٹریکٹ ''ہو یا ڈرکھائم کا ''اجتماعی شعور"، اس اصول پر متفق ہے کہ انسان کی فلاح صرف اسی وقت ممکن ہے جب وہ اپنے ذاتی مفاد کو اجتماعی خیر (Common Good) کے تابع رکھے۔

یہی وہ اصول ہے جس نے انسانی معاشرت کو ایک مشترک اخلاقی نظام کے تحت جوڑے رکھا ہے۔ جہاں کسی کے حق کا آغاز ہوتا ہے، وہیں کسی دوسرے کے فرض کا دائرہ شروع ہو جاتا ہے۔ حق اور فرض دراصل ایک ہی اخلاقی وحدت کے دو پہلو ہیں—ایک مطالبۂ عدل کا، دوسرا ادائیگیِ ذمہ داری کا۔

اسلام نے اس آفاقی اصول کو اپنی تعلیمات میں نہ صرف برقرار رکھا، بل کہ اسے ایک روحانی بنیاد عطا کی۔ ''حق'' عربی میں ثبوت اور استحقاق کے معنی میں آتا ہے، یعنی وہ چیز جو عدل وانصاف کے اصول پر کسی کو ملنی چاہیے۔ جب کہ ''فرض'' اس ذمہ داری کو کہتے ہیں جو کسی پر عائد کی گئی ہو، خواہ وہ اللہ کے حضور ہو یا بندوں کے درمیان۔

اسلامی معاشرت میں حقوق وفرائض کا توازن انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر قائم کیا گیا ہے۔ فرد کے حقوق اس کے ذاتی تحفظ، عزت، آزادی اور ضروریاتِ زندگی سے متعلق ہیں، جب کہ اس کے فرائض دوسروں کے ساتھ عدل، احترام، تعاون اور خیر خواہی کے رویوں سے متعلق ہیں۔ اگر ہر شخص اپنے فرائض کی ادائیگی میں مخلص ہو تو پورے معاشرے کے حقوق خود بہ خود محفوظ ہو جاتے ہیں۔

اسی اصول کو قرآن نے یوں بیان کیا ہے:

''وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ''(المائدہ:2)

نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کا ساتھ دو، اور گناہ وزیادتی میں باہم تعاون نہ کرو۔

اسلامی نظامِ اخلاق کی یہی وہ خوبی ہے جسے ہم "One Moral System" کہہ سکتے ہیں، ایک ایسا ہمہ گیر اخلاقی ڈھانچہ جس میں انسان کی انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتیں ایک ہی معیارِ عدل کے تابع ہیں۔ اس نظام میں کسی طبقے، قوم یا فرد کے لیے جداگانہ اخلاقیات نہیں بل کہ سب کے لیے ایک ہی اصول کارفرما ہے: اللہ کی بندگی، بندوں کے ساتھ انصاف اور خیر خواہی کا عمومی جذبہ۔

2-بنیادی معاشرتی حقوق

انسانی معاشرت کا استحکام صرف اس وقت ممکن ہے جب فرد کے بنیادی حقوق کو اس کی فطری حرمت اور انسانی وقار کے مطابق تسلیم کیا جائے۔ یہ اصول ہر تہذیب اور ہر مذہب میں کسی نہ کسی صورت میں موجود رہا ہے۔ جدید انسانی فکر نے اسے Universal Human Rights کے عنوان سے تسلیم کیا، جب کہ اسلامی تعلیمات نے اسی حقیقت کو نہایت متوازن اور اخلاقی بنیاد پر واضح کیا ہے۔

اسلامی تصور کے مطابق انسان کو جو حقوق عطا کیے گئے ہیں، ان کی بنیاد محض قانونی ضرورت یا سماجی سہولت نہیں، بل کہ وہ انسان کی فطری حرمت اور خدا کی خلافت کے تصور سے پھوٹتی ہے۔ اسلام نے فرد کو جو مقام دیا ہے، وہ کسی طبقاتی امتیاز یا مادی قوت کی بنا پر نہیں، بل کہ اس حیثیت سے کہ وہ اللہ کی مخلوق ہے اور اس کی روح میں خالق کی امانت ودیعت کی گئی ہے۔ اسی لیے اسلامی معاشرت میں ہر شخص کی جان، مال، عزت، رائے اور فکری آزادی محترم سمجھی گئی ہے۔

یہ حقوق محض مطالبات نہیں، بل کہ اخلاقی ذمہ داریاں بھی ہیں۔ ایک مسلمان جب اپنے لیے ان حقوق کا استحقاق مانتا ہے تو اسی لمحے وہ دوسروں کے لیے انہی حقوق کا محافظ بھی بن جاتا ہے۔ اسلام کا عدل اسی باہمی احترام اور توازن سے قائم ہوتا ہے۔

2.1-حقِ زندگی اور سلامتی

زندگی اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت اور اس کی سب سے عظیم امانت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام تہذیبوں نے انسانی جان کے احترام کو بنیادی اخلاقی اصول کے طور پر تسلیم کیا ہے۔ جدید انسانی حقوق کے منشور

(Universal Declaration of Human Rights, 1948)نے بھی ''حقِ زندگی'' کو ہر انسان کا غیر مشروط حق قرار دیا۔

اسلامی تعلیمات میں اس اصول کو مزید جامع اور روحانی بنیاد دی گئی ہے۔ قرآنِ مجید نے انسانی جان کے احترام کو پورے معاشرتی نظام کی اساس قرار دیا ہے:

''مَن قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا'' (المائدہ:32)

جس نے کسی ایک جان کو ناحق قتل کیا، گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا۔

یہ آیت انسانی زندگی کی حرمت کو ایسی جامع شکل میں بیان کرتی ہے جس کی نظیر کسی اور نظامِ اخلاق میں نہیں ملتی۔ اسلام میں زندگی کا احترام صرف مسلمانوں کے لیے مخصوص نہیں، بل کہ تمام انسانوں کے لیے عام ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ «لَزَوَالُ الدُّنْيَا أَهْوَنُ عَلَى اللهِ مِنْ قَتْلِ رَجُلٍ مُسْلِمٍ (جامع الترمذی، کتاب الدیات، باب ما جاء فی تغلیظ قتل المؤمن، حدیث: 1395)

''زوالِ دنیا اللہ کے نزدیک اس سے ہلکا ہے کہ کسی ایک انسان کا ناحق خون بہا دیا جائے۔''

اسلامی شریعت نے اس اصول کے تحفظ کے لیے عملی اقدامات مقرر کیے، مثلاً قصاص کا قانون، امن و امان کے قیام کی ذمہ داری، اور ایسے تمام اسباب کی ممانعت جو انسانی جان یا معاشرتی سلامتی کو خطرے میں ڈالیں۔ اسی طرح خودکشی، ظلم، دہشت گردی، اور فساد فی الارض کو سخت ترین جرائم قرار دیا گیا ہے۔

اسلام کا تصورِ زندگی محض بقا کا نہیں، بل کہ سلامتی اور امن کا ہے۔ ''اسلام'' کا لفظ خود ''سَلام'' سے نکلا ہے، یعنی امن و خیر۔ لہٰذا ایک سچا مومن نہ صرف اپنی زندگی کا احترام کرتا ہے، بل کہ دوسروں کی جان، مال اور عزت کی حفاظت کو اپنی دینی ذمہ داری سمجھتا ہے۔ یہی احساسِ حرمت وہ بنیاد ہے جس پر ایک پُرامن، محفوظ اور باوقار معاشرہ قائم ہو سکتا ہے۔

2.2 حقِ عزت و حرمتِ انسان

انسانی تاریخ میں عزت و حرمتِ ذات ہمیشہ سے اخلاقی و قانونی نظام کا مرکزی نکتہ رہی ہے۔ جدید دنیا میں اسے "Human Dignity" کے عنوان سے عالمی اقدار کا حصہ تسلیم کیا گیا۔ یہی تصور اسلامی تعلیمات میں نہ صرف تائیدی حیثیت رکھتا ہے، بل کہ اپنی وسعت اور عمومیت کے لحاظ سے بے نظیر ہے۔

اسلامی معاشرت کی بنیاد اس اصول پر قائم ہے کہ ہر انسان عزت اور حرمت میں برابر ہے۔ قرآنِ مجید نے انسان کی تکریم کو ایک آفاقی قدر کے طور پر پیش کیا ہے:

"وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ" (بنی اسرائیل:70)

ہم نے بنی آدم کو بزرگی بخشی ہے۔

یہ تکریم کسی نسل، رنگ، زبان یا قومیت کی بنیاد پر نہیں، بل کہ صرف انسان ہونے کے شرف پر قائم ہے۔ اسلام نے اس عزت کو اجتماعی زندگی میں محفوظ رکھنے کے لیے واضح ہدایات دی ہیں۔ کسی کی غیبت کرنا، بہتان لگانا یا تمسخر اڑانا صریحاً ممنوع قرار دیا گیا ہے کیوں کہ یہ اعمال انسان کی حرمت کو پامال کرتے اور معاشرتی اعتماد کو مجروح کر دیتے ہیں۔

قرآن نے فرمایا:

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسَىٰ أَن يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ" (الحجرات:11)

ایمان والو، کوئی قوم کسی قوم کا تمسخر نہ اڑائے، بعید نہیں کہ وہ ان سے بہتر ہو۔

نبی اکرم ﷺ نے اپنے خطبۂ حجۃ الوداع میں انسان کی حرمت کو کعبۂ معظمہ کی حرمت سے تشبیہ دے کر فرمایا:

عَنْ أَبِي بَكْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: خَطَبَنَا النَّبِيُّ ﷺ يَوْمَ النَّحْرِ، فَقَالَ:

»إِنَّ دِمَاءَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ وَأَعْرَاضَكُمْ عَلَيْكُمْ حَرَامٌ، كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هَذَا، فِي بَلَدِكُمْ هَذَا، فِي شَهْرِكُمْ هَذَا«

(صحیح البخاری، کتاب الحج، باب الخطبۃ أیام منی، حدیث:1739)

''تمھاری جانیں، تمھارا مال اور تمھاری عزتیں تم پر اسی طرح حرام ہیں جیسے آج کے دن کی حرمت تمھارے اس شہر میں ہے۔''

یہ اعلان انسانی مساوات اور احترامِ ذات کا ایسا منشور ہے جو تمام زمانوں کے لیے رہ نمائی فراہم کرتا ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ معاشرے میں ہر فرد کو عزتِ نفس کے ساتھ جینے کا حق حاصل ہو۔ کسی کی بے عزتی، تذلیل یا تمسخر صرف ایک شخص کی توہین نہیں، بل کہ پوری انسانیت کی توہین ہے۔

ایک صالح معاشرہ وہ ہے جہاں ہر انسان کو اس کی عزت و مقام کے ساتھ پہچانا جائے، اختلافِ رائے کو دشمنی میں نہ بدلا جائے، اور کم زوروں کے ساتھ بھی وہی سلوک روا رکھا جائے جو طاقت ور اپنے لیے پسند کرتے ہیں۔ یہی وہ اخلاقی فضا ہے جس میں انسانی برادری محبت، احترام اور اعتماد کے رشتے میں بندھ سکتی ہے۔

2.3 حقِ مساوات و عدل

عدل انسانی معاشرت کی وہ بنیاد ہے جس پر فرد کی عزت، امن اور توازن کا پورا ڈھانچہ قائم ہوتا ہے۔ اگر عدل مٹ جائے تو مساوات، اعتماد اور انسانی حرمت سب ختم ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے انسانی تاریخ کے ہر بڑے مفکر نے عدل کو تمدن کی روح قرار دیا ہے۔ افلاطون نے کہا تھا کہ "عدل دراصل نفسِ انسانی کی ہم آہنگی کا نام ہے"، جب کہ ارسطو کے نزدیک "عدل وہ صفت ہے جو انسان کو دوسروں کے ساتھ انصاف کرنے پر آمادہ کرتی ہے"۔ جدید فلسفۂ اخلاق میں بھی مساوات کو انسانی وقار کا بنیادی اصول مانا گیا ہے، جیسا کہ اقوامِ متحدہ کے اعلامیۂ حقوقِ انسانی (UDHR, 1948) میں بیان ہوا کہ "تمام انسان وقار اور حقوق کے اعتبار سے برابر پیدا کیے گئے ہیں۔"

اسلام نے اسی آفاقی اصول کو الہامی بنیاد عطا کی۔ قرآنِ مجید نے عدل کو صرف ایک قانونی یا سماجی تقاضا نہیں، بل کہ ایمان کا لازمی حصہ قرار دیا ہے:

''إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ''(النحل:90)

اللہ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔

اسلامی مساوات کا مفہوم یہ ہے کہ انسانوں کے درمیان عزت و حقوق کے لحاظ سے کوئی امتیاز باقی نہ رہے۔ نہ نسل، نہ رنگ، نہ زبان، نہ مال و دولت کسی کے برتر یا کمتر ہونے کا معیار ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

''أَلَا إِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ، وَإِنَّ أَبَاكُمْ وَاحِدٌ، أَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلَى عَجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلَى عَرَبِيٍّ، وَلَا لِأَحْمَرَ عَلَى أَسْوَدَ وَلَا لِأَسْوَدَ عَلَى أَحْمَرَ، إِلَّا بِالتَّقْوَى''م(سند احمد، حدیث:23489)

''تمام انسان آدم کی اولاد ہیں، اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے۔ کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر، کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب سے۔''

یہ اصول معاشرتی عدل اور انسانی مساوات کا سرچشمہ ہے۔ اس کے مطابق ہر شخص کو یکساں مواقع حاصل ہونے چاہییں تاکہ وہ اپنی صلاحیتوں کو بہ روے کار لا سکے۔ اسلام نے عدل کو محض عدالت کے دائرے تک محدود نہیں رکھا، بل کہ اسے زندگی کے ہر پہلو تک وسعت دی ہے — خاندانی تعلقات، معاشی معاملات، حکومتی نظم یا تعلیمی ادارے، سب پر یہی اصول حاوی ہے۔

عدل کی یہ روح معاشرے میں اس وقت باقی رہتی ہے جب افراد، ادارے اور اہلِ اقتدار اپنی ذمہ داریاں ایمان داری سے ادا کریں۔ اگر صاحبِ اقتدار عدل چھوڑ دیں یا عوام حق گوئی سے گریز کریں تو مساوات کی بنیاد متزلزل ہو جاتی ہے۔ اسلامی معاشرت کا مقصود یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کا حق بلا امتیاز ملے، اور کوئی کسی کے استحقاق پر زیادتی نہ کرے۔ اسی عدل کے قیام سے معاشرہ امن، توازن اور اعتماد کا گہوارہ بنتا ہے۔

2.4- حقِ تعلیم و تربیت

علم انسان کی شناخت اور ترقی کی بنیاد ہے۔ تمام تہذیبوں میں تعلیم کو انسانی وقار اور آزادیِ فکر کا سرچشمہ مانا گیا ہے۔ افلاطون نے تعلیم کو "روح کی تربیت" کہا، ارسطو کے نزدیک یہ "خیر کی پہچان کا وسیلہ" ہے، اور جدید فلسفی کانٹ نے اسے وہ عمل قرار دیا ہے جس سے انسان "انسانیت کے قابل" بنتا ہے۔ یونیسکو (UNESCO) کے مطابق تعلیم کا مقصد "امن، انسانی حقوق اور باہمی احترام پر مبنی عالمی شہری شعور" پیدا کرنا ہے۔

اسلام نے اسی آفاقی اصول کو وحی کی بنیاد پر استوار کیا۔ قرآنِ مجید نے انسان کی تخلیق اور اس کی فضیلت کا سبب علم کو بتایا ہے:

''عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ العلق''

اللہ نے انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ علم انسان کی شناخت اور تکریم کا سرچشمہ ہے۔اسی لیے اسلامی معاشرت میں ہر فرد کو علم کے حصول کا حق حاصل ہے—خواہ وہ مرد ہو یا عورت، امیر ہو یا غریب۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

''طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ''

(سنن ابن ماجہ، حدیث: 224)

''علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔''

اسلامی تصورِ علم محض معلومات جمع کرنے تک محدود نہیں، بل کہ تربیتِ کردار اور اصلاحِ عمل تک پھیلا ہوا ہے۔ تعلیم کا مقصد انسان کو اللہ کی معرفت تک پہنچانا، اس کی فطرت میں ودیعت خیر کے بیج کو پروان چڑھانا، اور اسے اپنی ذمہ داریوں کا شعور دینا ہے۔

اسلامی تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے کہ تعلیم و تربیت کے اس حق کو اجتماعی سطح پر یقینی بنانے کے لیے مکاتب، مدارس، کتب خانے اور اوقاف قائم کیے گئے۔ ان اداروں کا مقصد یہ تھا کہ علم محض چند خواص کی میراث نہ رہے، بل کہ پوری امت کا مشترک سرمایہ بنے۔

ایک صالح معاشرہ وہ ہے جہاں تعلیم صرف ذہنوں کو نہیں، دلوں کو بھی روشن کرتی ہے؛ جہاں تربیت کا مقصد کردار کی درستی ہو نہ کہ صرف قابلیت کی نمائش۔ اسلامی معاشرت میں تعلیم و تربیت کا حق دراصل روحانی بیداری اور اخلاقی تعمیر کا حق ہے۔ اس کے بغیر کوئی معاشرہ اپنی انسانی، تہذیبی اور اخلاقی عظمت برقرار نہیں رکھ سکتا۔

2.5- حقِ امداد و تعاون

انسانی معاشرت کا حسن اس میں ہے کہ فرد اپنی زندگی کو صرف اپنی ذات کے گرد محدود نہ رکھے، بل کہ دوسروں کی بھلائی، خیر خواہی اور خدمت کو اپنی ذمہ داری سمجھے۔ انسانی تاریخ میں ہر بڑے مفکر نے باہمی تعاون کو تمدن کی بنیاد قرار دیا ہے۔ یونانی فلسفی ارسطو کے نزدیک انسان "سماجی وجود" ہے، جو فطری طور پر اجتماع میں جینے کا خواہاں ہے۔ اگست کومت نے ایثار کو اخلاق کی اصل روح کہا، جب کہ جدید سماجی فلسفہ (Social

(Contract Theory) اس بات پر متفق ہے کہ کسی بھی معاشرے کی بقا اس وقت ممکن ہے جب افراد باہمی تعاون اور احترام کا رشتہ قائم رکھیں۔

اسلام نے اسی فطری اصول کو ایمان کا عملی تقاضا بنایا۔ قرآنِ مجید نے ارشاد فرمایا:

''وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى''(المائدہ:2)

نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو۔

یہ آیت انسانی تعلقات کا وہ بنیادی اصول طے کرتی ہے جس پر ایک عادل، مہربان اور مستحکم معاشرہ قائم ہوتا ہے۔ اسلام میں تعاون محض اخلاقی فضیلت نہیں، بل کہ دینی فریضہ ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

''لَيْسَ الْمُؤْمِنُ الَّذِي يَبِيتُ شَبْعَانَ وَجَارُهُ جَائِعٌ إِلَى جَنْبِهِ''(المستدرک للحاکم، حدیث: 7300)

''وہ شخص مومن نہیں جو پیٹ بھر کر سوئے اور اس کا پڑوسی بھوکا رہے۔''

اسلامی نظامِ معاشرت میں امداد و تعاون کی کئی منظم صورتیں قائم کی گئیں—زکات، صدقات، وقف، بیت المال، اور رفاہی نظم، ان سب کا مقصد یہی تھا کہ کوئی شخص معاشرت کے دائرے سے محروم نہ رہے۔ یہ نظام محض خیرات نہیں، بل کہ سماجی انصاف کی ایک مربوط شکل ہے۔

باہمی تعاون کا یہ جذبہ صرف مالی اعانت تک محدود نہیں، بل کہ اس میں نصیحت، رہ نمائی، حوصلہ افزائی، اور علم کی تقسیم بھی شامل ہے۔ معاشرتی بقا کا انحصار اسی اصول پر ہے کہ ہر فرد دوسرے کا سہارا بنے۔ اگر لوگ ایک دوسرے کی حاجتوں سے بے پرواہو جائیں تو اجتماعیت کی روح مر جاتی ہے۔

اسلامی اخلاقیات انسان کے دل میں یہی احساس زندہ رکھتی ہیں کہ دوسروں کے لیے خیر چاہنا دراصل اپنے ایمان کی تکمیل ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جو امداد، تعاون اور ایثار کے جذبے سے خالی ہو، وہ بظاہر آباد ہو کر بھی باطن میں ویران ہوتا ہے۔

2.6- حقِ آزادی وعدل

آزادی انسان کے وجود کی اساس اور اس کی فطرت کا سب سے بنیادی تقاضا ہے۔ یہ صرف عمل یا رائے کی آزادی نہیں بل کہ انسانی وقار، خود ارادیت اور اخلاقی ذمے داری کا اظہار ہے۔ انسانی تاریخ میں آزادی کو ہمیشہ عدل کے ساتھ جوڑا گیا ہے کیوں کہ آزادی بغیر عدل کے انتشار بن جاتی ہے اور عدل بغیر آزادی کے جمود۔ **جان لاک، ژاں ژاک روسو** اور **جان اسٹورٹ مل** جیسے مفکرین نے انسان کی آزادی کو سماجی معاہدے اور اخلاقی قانون کا محور قرار دیا۔ ان کے نزدیک معاشرے کی اصل غایت یہ ہے کہ فرد کی آزادی کو اس حد تک محفوظ رکھا جائے جہاں وہ دوسروں کی آزادی میں مداخلت نہ کرے۔

اسلام نے اسی آفاقی اصول کو وحی کی بنیاد پر استوار کیا۔ قرآنِ مجید نے انسان کو غلامی، جبر اور استبداد سے آزاد کر کے اسے خلیفۃ اللہ کے منصب سے سرفراز کیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ '' (الإسراء:70)

ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی ہے۔

یہ عزت اسی وقت محفوظ رہ سکتی ہے جب انسان کو رائے دینے، فیصلہ کرنے، اور ناحق ظلم کے خلاف کھڑے ہونے کا موقع حاصل ہو۔ اسلام نے کسی قوم، نسل یا طبقے کی برتری کو رد کر کے عدل کو تمام انسانی تعلقات کی اساس بنایا۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

'' وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى''(سنن ابی داؤد، حدیث:5116)

''تمام انسان کنگھی کے دانتوں کی طرح برابر ہیں۔''

قرآن نے جہاں آزادیِ فکر اور ارادۂ انسانی کو سراہا ہے، وہیں ظلم، جبر اور ناانصافی کے خلاف جدوجہد کو ایمان کا تقاضا قرار دیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

''إِنَّ اللهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ ''(النساء:58)

اسلامی تاریخ میں خلفاے راشدین نے اسی اصول کو عملی صورت دی۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اپنے پہلے خطبۂ خلافت میں فرمایا تھا:

''اے لوگو! مجھ کو تم پر امارت دی گئی ہے حالاں کہ میں تم میں سے کسی سے بہتر نہیں۔ اگر میں بھلائی پر رہوں تو میری مدد کرو اور اگر میں راہِ خطا پر جاؤں تو مجھے درست کرو۔ سچائی امانت ہے اور جھوٹ خیانت۔ تمھارے کم زور کا حق میرے نزدیک اتنا ہی مضبوط ہے کہ میں ان شاء اللہ اسے دلا کر رہوں گا اور تمھارا طاقت ور میرے نزدیک کم زور ہے یہاں تک کہ میں ان شاء اللہ اس سے حق چھین کر کم زور کو دوں۔'' (سیرت ابنِ ہشام)

چناں چہ **حق آزادی و عدل** دراصل انسانی شرف اور معاشرتی توازن کی ضامن قوت ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جو عدل سے خالی ہو، وہ آزادی کے نام پر ظلم پیدا کرتا ہے اور جہاں آزادی سلب کر لی جائے، وہاں عدل بے معنی ہو جاتا ہے۔ ان دونوں کا امتزاج ہی ایک منصف، آزاد اور مہذب معاشرت کی بنیاد ہے۔

2.7- صحت مند ماحول کا حق

انسانی زندگی صرف بقا کا نام نہیں بل کہ ایک ایسی متوازن اور پاکیزہ فضا کی ضرورت بھی رکھتی ہے جس میں جسم و جان کی سلامتی، ذہن کی تازگی اور روح کی بالیدگی ممکن ہو۔ صحت مند ماحول ہر انسان کا بنیادی حق ہے کیوں کہ آلودہ فضا، گندا پانی، شور، بے ہنگم آبادی اور بگاڑ یافتہ سماجی رویے انسان کی طبعی اور اخلاقی دونوں صحت کو مجروح کرتے ہیں۔

ماحول محض فطری عناصر، ہوا، پانی، زمین کا مجموعہ نہیں بل کہ انسانی تعلقات، طرزِ زندگی اور سماجی نظم کا بھی آئینہ دار ہوتا ہے۔ چناں چہ ایک باشعور فرد کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے اطراف کے ماحول کو صاف، محفوظ اور انسانی شایستگی کے مطابق رکھنے کی کوشش کرے۔ صحت مند معاشرت دراصل اس اخلاقی شعور کا مظہر ہے جس میں انسان اپنے وجود ہی نہیں دوسروں کی زندگی کے توازن کو بھی امانت سمجھتا ہے۔

اسلامی تعلیمات میں بھی اس حقیقت کی طرف گہری توجہ دلائی گئی ہے کہ زمین انسان کے لیے امانت ہے اور اس میں فساد یا بگاڑ پیدا کرنا اس امانت کی خیانت ہے۔ قرآنِ مجید میں ارشادِ ربانی ہے:

''وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا'' (الأعراف:56)

''اور زمین میں فساد مت پھیلاؤ بعد اس کے کہ اس کی درستی کی جا چکی ہو۔''

یہ آیت گویا انسان کو یاد دلاتی ہے کہ کائنات کی درستی اور توازن اسی وقت برقرار رہتا ہے جب انسان اپنی ضرورتوں کو فطرت کے دائرے میں محدود رکھے اور اس کی اصل ساخت میں بگاڑ پیدا نہ کرے۔

اسی مفہوم کو نبی کریم ﷺ نے ایک نہایت دل نشین مثال سے واضح فرمایا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

»إِنْ قَامَتِ السَّاعَةُ وَفِي يَدِ أَحَدِكُمْ فَسِيلَةٌ فَإِنِ اسْتَطَاعَ أَنْ لَا تَقُومَ حَتَّى يَغْرِسَهَا فَلْيَغْرِسْهَا«

(مسند احمد، حدیث: 12902)

''اگر قیامت قائم ہو جائے اور تم میں سے کسی کے ہاتھ میں ایک پودا ہو تو اگر ممکن ہو کہ قیامت آنے سے پہلے وہ اسے لگا دے تو اسے لگا دینا چاہیے۔''

یہ ہدایت دراصل انسان کی اخلاقی ذمہ داری کو اس حد تک وسعت دیتی ہے کہ حتیٰ کہ انجامِ دنیا کے لمحے میں بھی خیر کا کوئی عمل ترک نہ کیا جائے۔ صحت مند ماحول دراصل اخلاقی ایمان داری، اجتماعی شعور اور فطرت کے احترام کا مظہر ہے۔

2.8 اظہارِ رائے اور شمولیتِ اجتماعی کا حق

انسانی معاشرت میں اظہارِ رائے کا حق صرف آزادیِ کلام نہیں بل کہ شعور، خود اختیاری اور اخلاقی ذمہ داری کی علامت ہے۔ انسانی تاریخ میں یہ اصول ہمیشہ تہذیبی ترقی اور فکری آزادی کا محرک رہا ہے۔ ارسطو کے نزدیک شہری زندگی اسی وقت صالح بنتی ہے جب افراد اجتماعی گفت گو میں شریک ہوں، اور روسو کے مطابق اجتماعی ارادے کی تعمیر ہر شہری کے آزاد اظہارِ رائے پر موقوف ہے۔

معاشرہ اسی وقت متوازن اور بامقصد بن سکتا ہے جب اس کے افراد کو اپنے خیالات کے اظہار اور اجتماعی فیصلوں میں شرکت کا موقع حاصل ہو۔ اظہار کا یہ حق انسان کے وقار، علم اور ارادے کا مظہر ہے، مگر اس کے ساتھ اخلاقی ذمہ داری بھی وابستہ ہے کہ رائے خیر خواہی، دیانت اور عدل کے اصولوں کے مطابق ہو۔ اختلافِ

رائے انسانی ارتقا کا محرک ہے، لیکن یہ تبھی تعمیری ثابت ہوتا ہے جب اس میں تہذیب، احترام اور سچائی کا پاس رکھا جائے۔

اسی لیے جمہوری معاشروں سے لے کر علمی مجالس تک ہر اجتماعی ڈھانچے کی بنیاد مشاورت اور باہمی گفت گو پر رکھی گئی ہے۔ یہی اصول اسلامی معاشرت میں بھی تائیدی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآنِ مجید میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ﴾ (الشوریٰ:38)

''اور ان کے معاملات باہمی مشورے سے طے پاتے ہیں۔''

یہ اصول اس بات کی دلیل ہے کہ اجتماعی فیصلے کسی فرد یا طبقے کی آمریت پر نہیں بل کہ سب کے مشورے اور امانت دارانہ گفت گو پر مبنی ہونے چاہییں۔

نبی کریم ﷺ کا طرزِ عمل بھی اسی قرآنی روح کا مظہر تھا۔ آپ ﷺ اہم معاملات میں اپنے اصحاب سے مشورہ فرماتے اور اکثر ان کی رائے کو اختیار کر لیتے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

»اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ« (سنن ابی داؤد، حدیث:5128)

''جس سے مشورہ لیا جائے وہ امانت دار ہوتا ہے۔''

یہ ارشاد اس حقیقت کی طرف رہ نمائی کرتا ہے کہ رائے دینا بھی امانت ہے اور مشورے میں دیانت، خیر خواہی اور ذمہ داری وہ اخلاقی اوصاف ہیں جو ایک صحت مند معاشرت کے لیے ناگزیر ہیں۔

3- معاشرتی فرائض

جس طرح حقوق کے بغیر معاشرہ ظلم و ناانصافی کا شکار ہو جاتا ہے اسی طرح فرائض کی ادائیگی کے بغیر وہ بکھر کر رہ جاتا ہے۔ معاشرتی توازن دراصل اسی شعور کا نام ہے کہ ہر فرد جان لے کہ اس پر دوسروں کے حقوق کے مقابلے میں کچھ ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔ اگر انسان صرف اپنے حق کا مطالبہ کرے مگر کسی کے حق کی حفاظت کا بوجھ نہ اٹھائے تو وہ اجتماعیت کا حصہ نہیں رہتا۔

اسلام نے معاشرت کو ایک اخلاقی عہد کے طور پر پیش کیا ہے جس میں ہر فرد اللہ کے سامنے جواب دہ ہے کہ اس نے اپنی قوت، اپنے علم اور اپنے اختیار کو دوسروں کے فائدے میں کتنا صرف کیا۔ قرآنِ مجید نے اسی ذمہ داری کو یوں بیان کیا:

''وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ''(آل عمران، 3:104)

''اور تم میں ایک گروہ ایسا ضرور ہونا چاہیے جو بھلائی کی طرف بلائے، نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے۔''

یہ آیت بتاتی ہے کہ اسلامی معاشرہ محض مفادات کا مجموعہ نہیں بل کہ خیر و اصلاح کا ایک مشترکہ مقصد ہے۔ یہاں ہر فرد اپنے کردار، اپنی نیت اور اپنے عمل سے اس مقصد کی تکمیل میں شریک ہے۔

فرائض کی اس دنیا میں انسان کا امتحان یہ نہیں کہ وہ اپنے حقوق کتنے جانتا ہے بل کہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کے لیے کتنا جیتا ہے۔ یہی طرزِ عمل معاشرت میں محبت، اعتماد اور عدل کی فضا پیدا کرتا ہے اور یہی وہ بنیاد ہے جس پر ایک اخلاقی و متمدن امت وجود میں آتی ہے۔

3.1 احترامِ انسانیت اور حسنِ سلوک

اسلامی معاشرت کی روح احترامِ انسانیت ہے۔ انسان خواہ کسی نسل، زبان، مذہب یا طبقے سے تعلق رکھتا ہو، اس کے وجود میں اللہ نے کرامت رکھی ہے۔ یہی کرامت ہے جو ہر فرد کو احترام، مہربانی اور انصاف کا مستحق بناتی ہے۔ قرآنِ مجید نے صاف الفاظ میں فرمایا:

''وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ'' (الإسراء، 17:70)

''ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی ہے۔''

یہ آیت ہمیں یاد دلاتی ہے کہ احترام کا دائرہ صرف مسلمانوں یا اپنے قبیلے تک محدود نہیں بل کہ یہ تمام انسانوں کو محیط ہے۔ یہی اصول آج عالمی انسانی حقوق کے منشور میں ''inherent dignity of all members of the human family'' کے عنوان سے تسلیم کیا گیا ہے۔

نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

''الرَّاحِمُونَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ، ارْحَمُوا مَنْ فِي الْأَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ''(سنن ابی داود، حدیث 4904)

''رحم کرنے والوں پر رحمٰن رحم فرماتا ہے، تم زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔''

یہ تعلیم صرف جذباتی ترغیب نہیں بل کہ ایک اخلاقی فریضہ ہے۔ معاشرت اسی وقت شایستہ رہتی ہے جب انسان ایک دوسرے کے جذبات کا لحاظ رکھیں، کمزوروں کے ساتھ نرمی برتیں، بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت کا رویہ اپنائیں۔

اسلام نے حسنِ سلوک کو ایمان کا پیمانہ قرار دیا۔ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

''خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ''(صحیح البخاری، کتاب الأدب، حدیث 6136)

''تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ بہتر ہو۔''

یہ ارشاد اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ حسنِ سلوک کا آغاز گھر سے ہوتا ہے، پھر یہ دائرہ خاندان، پڑوسی، معاشرہ اور پوری انسانیت تک پھیل جاتا ہے۔ احترامِ انسانیت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم دوسروں کے حقوق، عزت اور جذبات کی حفاظت کریں۔ کسی کی تحقیر، تمسخر یا غیبت دراصل اس کے وقار پر حملہ ہے اور یہ رویہ پورے معاشرے کے اخلاقی توازن کو بگاڑ دیتا ہے۔

اسلامی معاشرت کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ انسان کو انسان ہونے کے ناتے عزت دی جائے۔ یہی وہ روش ہے جو معاشرت کو سنگ دلی سے بچاتی اور اسے رحمت و اخوت کے راستے پر قائم رکھتی ہے۔

3.2 عدل و انصاف کا قیام

اسلامی معاشرت کی بنیاد جس اصول پر قائم ہے وہ عدل ہے۔ عدل صرف ایک قانونی اصطلاح نہیں بل کہ اخلاقی زندگی کی روح ہے۔ اس کے بغیر کوئی معاشرہ پائیدار نہیں رہ سکتا۔ عدل کا مفہوم یہ ہے کہ ہر چیز اپنے صحیح مقام پر ہو، ہر شخص کو اس کا حق ملے اور کسی پر ظلم نہ ہو۔ قرآنِ مجید نے اہلِ ایمان کو حکم دیا:

''إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ'' (النحل، 16:90)

''بے شک اللہ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔''

یہ آیت اس بات کا اعلان ہے کہ عدل اللہ کے نزدیک صرف ایک سماجی نظم نہیں بل کہ ایک عبادت ہے۔ یہی وہ اصول ہے جسے ارسطو نے اپنی "Nicomachean Ethics" میں "Justice as the highest virtue" کہا اور جسے جدید دنیا نے Universal Principle of Equity کے طور پر اپنایا۔

نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

"إِنَّ أَحَبَّ النَّاسِ إِلَى اللهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَأَدْنَاهُمْ مِنْهُ مَجْلِسًا إِمَامٌ عَادِلٌ"

(جامع الترمذی، حدیث 1329)

"قیامت کے دن اللہ کے نزدیک سب سے محبوب اور اس کے قریب ترین شخص عادل حاکم ہو گا۔"

اسلام نے عدل کا حکم صرف حکمرانوں کو نہیں دیا بل کہ ہر فرد کو یہ ذمہ داری دی کہ وہ اپنے معاملات میں انصاف کرے چاہے وہ گھر کا فیصلہ ہو، کاروبار کا معاملہ ہو یا معاشرتی تعلق۔

عدل کی ضد ظلم ہے اور ظلم وہ زہر ہے جو معاشرت کے رگ و پے میں داخل ہو کر اسے مفلوج کر دیتا ہے۔ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

"الظُّلْمُ ظُلُمَاتٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ"

(صحیح البخاری، کتاب المظالم، حدیث 2447)

"ظلم قیامت کے دن اندھیروں کا سبب بنے گا۔"

عدل کا قیام محض انصاف پر مبنی فیصلوں کا نام نہیں بل کہ ایک ذہنی و اخلاقی رویہ ہے جس میں آدمی خود کو دوسرے کے مقام پر رکھ کر سوچتا ہے۔ جب یہ احساس عام ہو جائے کہ کسی پر زیادتی دراصل اپنے ہی ضمیر پر ظلم ہے تو معاشرہ خود بخود نور و انصاف سے معمور ہو جاتا ہے۔

اسلامی تاریخ میں خلفائے راشدین نے عدل کے اس معیار کو اپنی حکم رانی کا مرکز بنایا۔ حضرت عمرؓ کا مشہور قول ہے:

"اگر فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوکا مر گیا تو عمر سے اس کا حساب لیا جائے گا۔"

یہ وہ احساسِ جواب دہی ہے جو عدل کو قانون سے اخلاق کی سطح پر لے آتا ہے۔ چناں چہ عدل وانصاف کا قیام محض ریاستی فریضہ نہیں بل کہ ہر فرد کا عہدِ ایمان ہے۔ جب ہر شخص اپنے دائرے میں عدل قائم کرے تو پورا معاشرہ امن، توازن اور اعتماد کی فضا میں سانس لینے لگتا ہے۔

3.3- نیکی اور بھلائی میں باہمی تعاون

انسان فطرتاً سماجی مخلوق ہے۔ وہ تنہا اپنی ضروریات پوری نہیں کر سکتا بل کہ زندگی کے ہر میدان میں دوسروں کے تعاون کا محتاج ہے۔ یہی باہمی تعاون تمدن کا سرچشمہ ہے اور اسی سے معاشرت میں خیر، توازن اور ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ انسانی تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ وہی قومیں عروج پاتی ہیں جن کے افراد ذاتی مفاد سے بلند ہو کر ایک دوسرے کی بھلائی کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ باہمی مدد، ہمدردی، ایثار اور اشتراکِ عمل وہ آفاقی قدریں ہیں جن کے بغیر کسی معاشرے کی تعمیر ممکن نہیں۔

اسلامی معاشرت کی سب سے حسین خصوصیت یہ ہے کہ اس میں خیر کے کام اجتماعی جذبے سے انجام پاتے ہیں۔ کوئی نیکی تنہائی میں کامل نہیں ہوتی جب تک وہ دوسروں کی بھلائی سے نہ جڑ جائے۔ قرآنِ مجید نے اسی اصول کو نہایت جامع الفاظ میں بیان کیا:

''وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ'' (المائدہ، 5:2)

''نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو، گناہ اور زیادتی میں باہمی تعاون نہ کرو۔''

یہی اخلاقی روح آج کے عالمی ضابطوں مثلاً UNESCO's ''Global Citizenship Education Framework'' اور UN Charter of Compassion میں ''solidarity and shared responsibility'' کے اصول کے طور پر تسلیم کی گئی ہے۔

اسلام نے انسان کو یہ سکھایا کہ وہ اپنی قوت، اپنی صلاحیت اور اپنا وقت دوسروں کے لیے وقف کرے۔ اگر معاشرے کے افراد بھلائی میں شریک نہ ہوں تو برائی خود بخود غالب آ جاتی ہے۔ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

''مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ، وَذَلِكَ أَضْعَفُ الْإِيمَانِ'' (صحیح مسلم، حدیث 49)

''جو تم میں سے برائی کو دیکھے اسے اپنے ہاتھ سے روکے، اگر طاقت نہ ہو تو زبان سے، اور اگر وہ بھی نہ کر سکے تو دل میں برا جانے، اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔''

یہ تعلیم ہمیں بتاتی ہے کہ تعاون علی البر کا مطلب محض خیرات یا مدد نہیں بل کہ ایک فعال اخلاقی کردار ہے، برائی کے خلاف کھڑا ہونا، نیکی کے فروغ میں حصہ لینا، اور اجتماعی ذمہ داری کو ایمان کا تقاضا سمجھنا۔ اسلامی تاریخ میں اہلِ ایمان کا یہی وصف نمایاں رہا ہے۔ مسجدِ نبوی میں صفۂ اصحابؓ سے لے کر مدینہ کی مواخات تک اور بیت المال کے قیام سے لے کر وقف کے ادارے تک ہر قدم پر ہمیں یہ اصول کارفرما نظر آتا ہے کہ نیکی کے کام اکیلے نہیں ہوتے، وہ اجتماع کے سہارے پروان چڑھتے ہیں۔

درحقیقت وہ معاشرہ زندہ اور باشعور ہوتا ہے جس میں لوگ خیر کے کاموں میں ایک دوسرے کے دست و بازو بنیں۔ یہی وہ جذبہ ہے جو انسان کو خود غرضی سے نکال کر خدمت، ایثار اور قربانی کی راہ پر لاتا ہے اور یہی جذبہ اسلامی معاشرت کی حقیقی روح ہے۔

3.4-اصلاحِ معاشرہ اور اخلاقی شعور کی ترویج

کوئی مہذب معاشرہ اس وقت تک مستحکم نہیں ہو سکتا جب تک اس کے افراد میں خیر و شر کا شعور، برائی سے گریز، اور نیکی کے فروغ کا جذبہ زندہ نہ ہو۔ انسانی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ معاشروں کی بقا صرف مادی ذرائع سے نہیں بل کہ اخلاقی بیداری سے وابستہ ہوتی ہے۔ اگر افراد اپنے گرد کے ظلم، فریب، ناانصافی اور بدعنوانی پر خاموش رہیں تو یہ خاموشی خود ایک اجتماعی جرم بن جاتی ہے۔ اس لیے اصلاحِ معاشرہ کا فریضہ ایک آفاقی انسانی قدر ہے جو ہر ذی شعور انسان سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنی حد تک خیر کے فروغ اور شر کے ازالے کے لیے سرگرم رہے۔

اسلامی تعلیمات میں یہی اصول ''امر بالمعروف و نہی عن المنکر'' کے جامع عنوان سے بیان ہوا ہے، یعنی نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا۔ یہ صرف اخلاقی مشورہ نہیں بل کہ اجتماعی زندگی کا بنیادی فریضہ ہے۔ قرآنِ مجید میں فرمایا گیا:

﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ، تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ، وَتُؤْمِنُونَ بِاللهِ﴾(آلِ عمران،3:110)

''تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے پیدا کی گئی ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔''

یہ آیت بتاتی ہے کہ امتِ مسلمہ کی فضیلت محض عقیدے یا دعوے سے نہیں بل کہ عملی اصلاحی کردار سے وابستہ ہے۔ نیکی کا حکم دینا صرف زبانی نصیحت نہیں بل کہ بھلائی کی راہیں خود اختیار کرنا اور دوسروں کے لیے آسان بنانا ہے۔ اسی طرح برائی سے روکنے کا مطلب محض اعتراض کرنا نہیں بل کہ اس کے اسباب کے خاتمے کی سنجیدہ کوشش ہے۔

نبیِ کریم ﷺ نے فرمایا:

»وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ، لَتَأْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوفِ، وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ، أَوْ لَيُوشِكَنَّ اللهُ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عِقَابًا مِنْهُ، ثُمَّ تَدْعُونَهُ فَلَا يُسْتَجَابُ لَكُمْ«(جامع الترمذی، حدیث 2169)

''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تم ضرور نیکی کا حکم دو گے اور برائی سے روکو گے، ورنہ اللہ تم پر اپنا عذاب نازل کرے گا، پھر تم اسے پکارو گے مگر تمھاری دعا قبول نہ ہو گی۔''

یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ اصلاحِ معاشرہ محض اخلاقی فضیلت نہیں بل کہ دینی ذمہ داری ہے۔ اگر معاشرہ اجتماعی سطح پر اس فریضے سے غافل ہو جائے تو وہ اپنی روح کھو دیتا ہے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ یہ فرد سے شروع ہو کر خاندان، معاشرہ اور ریاست تک پھیلتا ہے۔ استاد کی نصیحت، والدین کی تربیت، عالمِ دین کی فہمائش اور حاکم کی عدل پر مبنی پالیسی—سب اسی فریضے کی مختلف صورتیں ہیں۔ جب یہ جذبہ زندہ رہتا ہے تو معاشرہ ظلم و فریب کے طوفان میں بھی اپنی سمت نہیں کھوتا۔ یہی وہ اصول ہے جو قوموں کو اخلاقی بقا، روحانی بالیدگی اور انسانی شرافت عطا کرتا ہے۔

3.5 معاشرتی خدمت اور فلاحی جذبہ

انسانی معاشرت کی بنیاد باہمی ہمدردی اور تعاون پر قائم ہے۔ اگر فرد صرف اپنی ذات تک محدود ہو جائے تو معاشرہ بے روح ہو جاتا ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں وہی اقوام زندہ اور باوقار رہیں جن کے افراد نے دوسروں کے لیے جینے کا سلیقہ سیکھا، محروموں کا سہارا بنے اور اجتماعی بھلائی کو اپنی ذاتی آسایش پر مقدم رکھا۔ خدمتِ خلق دراصل انسانی شرافت اور روحانی بالیدگی کا سب سے نمایاں مظہر ہے۔ یہ احساس انسان کو خود غرضی، حرص اور مقابلہ آرائی کے دائرے سے نکال کر ایثار، محبت اور قربانی کی دنیا میں لے جاتا ہے۔

اسلامی تعلیمات نے اسی انسانی قدر کو ایمان کے درجے تک بلند کیا ہے۔ خدمتِ خلق محض اخلاقی ترغیب نہیں بل کہ ایمان کا عملی تقاضا ہے۔ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

»خَيْرُ النَّاسِ أَنْفَعُهُمْ لِلنَّاسِ«

(شعب الایمان للبیہقی، حدیث 9075)

''لوگوں میں سب سے بہتر وہ ہے جو دوسروں کے لیے زیادہ نفع بخش ہو۔''

یہ مختصر مگر جامع ارشاد انسانی زندگی کے پورے فلسفے کو سمیٹ لیتا ہے۔ اسلام نے انسان کو یہ سکھایا کہ وہ اپنی ذات کو مرکز نہ بنائے بل کہ دوسروں کے لیے جینے کا سلیقہ سیکھے۔ یہی طرزِ فکر معاشرت میں محبت، ایثار اور یک جہتی پیدا کرتا ہے۔

قرآنِ مجید نے اس طرزِ زندگی کو احسان اور انفاق فی سبیل اللہ کے مفہوم میں بیان کیا ہے۔ زکات، صدقات، خیرات اور رضاکارانہ خدمت کے تمام اعمال اسی فلاحی جذبے کے مظاہر ہیں۔ ان سے نہ صرف محروموں کی حاجت پوری ہوتی ہے بل کہ دینے والے کے دل میں نرمی، شکر اور تواضع پیدا ہوتی ہے۔

اسلامی تاریخ میں فلاحِ عامہ کے بے شمار نمونے ملتے ہیں: مسجدِ نبوی میں صفۂ اصحابؓ، بیت المال کا نظم، وقف کے ادارے، یتیموں اور مسکینوں کی کفالت، اور بیماروں کی تیمارداری، یہ سب اسلامی معاشرت کے فلاحی شعور کی زندہ تصویریں ہیں۔

اسلام نے یہ بھی واضح کیا کہ نیکی کا میدان محض عبادات تک محدود نہیں۔ کسی پیاسے کو پانی پلانا، بیمار کی عیادت کرنا، راہ سے پتھر ہٹادینا یا کسی ضرورت مند کے چہرے پر مسکراہٹ لانا—یہ سب عبادت کے درجے میں آتے ہیں۔ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

»كُلُّ مَعْرُوفٍ صَدَقَةٌ« (صحیح مسلم، حدیث 1005)

''ہر نیکی صدقہ ہے۔''

درحقیقت، فلاحی جذبہ انسان کی روحانی نمو اور معاشرتی توازن کا ضامن ہے۔ جب ہر فرد اپنی حیثیت میں رضاکارانہ خدمت کو شعار بناتا ہے—کوئی دولت سے مدد کرے، کوئی علم سے، کوئی وقت سے—تو معاشرہ ایک زندہ، بامقصد اور انسان دوست نظام میں ڈھل جاتا ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جو انسان کو بندوں کی خدمت کے ذریعے رب کی رضا تک پہنچاتا ہے اور یہی اسلامی و آفاقی تمدن کا سب سے روشن پہلو ہے۔

3.6-ماحولیاتی تحفظ

انسانی تمدن آج جس موڑ پر کھڑا ہے وہاں سب سے بڑا چیلنج ماحول کی بقا اور زمینی توازن کا ہے۔ صنعتی ترقی، تیز رفتار شہری زندگی اور وسائل کے اندھا دھند استعمال نے فضا، پانی اور زمین—سب کو آلودگی کے شکنجے میں جکڑ دیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ انسانی صحت، حیاتیاتی نظام اور آب و ہوا سب خطرے میں ہیں۔ اس صورتِ حال نے ماحولیاتی تحفظ کو ایک عالمی اخلاقی ذمہ داری بنا دیا ہے۔

جدید دنیا نے اسے صرف ماحولیاتی سائنس کا نہیں بل کہ سماجی اخلاقیات کا مسئلہ تسلیم کیا ہے۔ اقوامِ متحدہ کے مختلف معاہدات، ماحولیاتی تحریکیں اور شہری ضوابط اسی احساس کی علامت ہیں کہ انسان اپنی بقا کے لیے قدرت کے ساتھ مصالحت پر مجبور ہو چکا ہے۔ ایک باشعور شہری کا فرض ہے کہ وہ صرف اپنے فائدے تک محدود نہ رہے بل کہ اجتماعی بھلائی کے لیے اپنی عادات و طرزِ زندگی میں ایسی تبدیلی لائے جو فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔

کچرے کی درستی، پانی کے استعمال میں اعتدال، درختوں کی افزائش، توانائی کی بچت، شور اور فضائی آلودگی سے گریز—یہ سب اب اخلاقی فضیلت نہیں بل کہ سماجی ذمہ داریاں ہیں۔ اگر ہر شخص اپنی روزمرہ زندگی میں ان اصولوں کو ملحوظ رکھے تو پورا معاشرہ صحت مند، متوازن اور پائدار ترقی کی راہ پر گام زن ہو سکتا ہے۔

اسلامی تعلیمات نے اس اخلاقی شعور کی بنیاد صدیوں پہلے رکھ دی تھی۔ قرآنِ مجید نے فرمایا:

﴿وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا﴾ (الأعراف، 7:56)

''زمین میں فساد نہ پھیلاؤ بعد اس کے کہ وہ درست کر دی گئی ہے۔''

اور نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

»إِنْ قَامَتِ السَّاعَةُ وَفِي يَدِ أَحَدِكُمْ فَسِيلَةٌ، فَإِنِ اسْتَطَاعَ أَنْ لَا تَقُومَ حَتَّى يَغْرِسَهَا، فَلْيَغْرِسْهَا «(مسند احمد، حدیث 12491)

''اگر قیامت قائم ہو جائے اور تم میں سے کسی کے ہاتھ میں ایک پودا ہو، تو اگر ممکن ہو تو اسے لگا دے۔''

یہ آیت اور حدیث گویا اس حقیقت کی یاد دہانی ہیں کہ زمین اللہ کی امانت ہے اور اس کے توازن کو برقرار رکھنا ہر انسان کا دینی و اخلاقی فرض ہے۔

اسلامی تناظر میں یہ فریضہ اس بات کا اظہار ہے کہ انسان خالق کی نعمتوں کا **امین** ہے، مالک نہیں۔ یوں ماحولیاتی تحفظ صرف سائنسی یا فنی مسئلہ نہیں بل کہ انسانی شرافت اور روحانی ذمہ داری کا مظہر ہے، وہ ذمہ داری جو انسان کو اپنے رب، اپنے معاشرے اور اپنی آیندہ نسلوں کے سامنے ادا کرنی ہے۔

4-جدید معاشرتی تناظر

جدید دنیا میں معاشرتی زندگی ایک نئے بحران سے دوچار ہے۔ مادی ترقی نے سہولتیں تو بڑھا دی ہیں مگر انسان کے اندر سے وہ روحانی ربط، ایثار اور ذمہ داری کا شعور بتدریج کم ہوتا جا رہا ہے۔ خود غرضی اور فرد پرستی نے

انسان کو اپنی ذات کے خول میں قید کر دیا ہے۔ اب وہ خدمت کے بجائے مقابلے، محبت کے بجائے مفاد، اور رفاقت کے بجائے مسابقت میں جینے لگا ہے۔

اسی کے ساتھ معاشروں میں عدمِ برداشت کا رویہ بڑھتا جا رہا ہے۔ اختلافِ رائے کو دشمنی سمجھ لیا جاتا ہے۔ تعصب، نفرت اور تشدد نے اجتماعی ہم آہنگی کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ یہی وہ عوامل ہیں جو معاشرتی امن کے لیے سب سے بڑا خطرہ بن چکے ہیں۔

طبقاتی تفاوت بھی جدید معاشرت کا ایک المیہ ہے۔ سرمایہ چند طبقات کے ہاتھ میں مرتکز ہو کر باقی طبقات کو احساسِ محرومی اور بے چینی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ دولت اور طاقت کے درمیان پیدا ہونے والا یہ فاصلہ نہ صرف انصاف کو مجروح کرتا ہے بل کہ معاشرتی استحکام کو بھی خطرے میں ڈال دیتا ہے۔

انھی تناظرات میں شہری حقوق اور فرائض کا توازن بھی بگڑتا جا رہا ہے۔ جدید انسان اپنے حقوق کے لیے تو بے قرار ہے مگر اپنے فرائض سے غافل۔ نتیجہ یہ ہے کہ معاشرت میں نظم و ضبط کی جگہ شکایت، اعتراض اور خود سری نے لے لی ہے۔

عالمی سطح پر انسانی حقوق کے چارٹر نے اگرچہ ایک اخلاقی منشور فراہم کیا ہے، مگر اس کی بنیاد محض فرد کی آزادی پر ہے، جب کہ اسلام نے حقوق کو عدل، خیر اور اجتماعیت کے اصولوں سے مربوط کیا ہے۔ اسلام کا تصورِ معاشرہ فرد کو آزادی کے ساتھ ساتھ ذمہ داری بھی دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر انسان اپنی آزادی کو خیر کے تابع نہ رکھے تو وہ معاشرے کے لیے خطرہ بن جاتا ہے۔

یہی وہ نقطۂ امتیاز ہے جو اسلامی فکر کو جدید معاشرتی فلسفے سے ممتاز کرتا ہے۔ اسلام کے نزدیک معاشرہ تبھی پائدار اور پرامن رہ سکتا ہے جب فرد اپنی ذات سے اوپر اٹھ کر خیرِ عامہ کے لیے جیتا ہے، جب اس کے اندر یہ احساس زندہ رہتا ہے کہ انسان کا وجود محض حیاتیاتی نہیں بل کہ اخلاقی و روحانی امانت ہے۔

خود آزمائی

۱ .انسانی معاشرت کی تشکیل میں فرد اور سماج کے باہمی تعلق کی کیا نوعیت ہے؟

۲ .اسلامی اور آفاقی تناظر میں انسانی حقوق کے مابین بنیادی فرق کیا ہے؟

۳ .حقِ زندگی اور حقِ عزت کے درمیان باہمی ربط کو واضح کیجیے۔

۴ .مساوات وعدل کا تصور جدید معاشروں میں کس طرح مجروح ہوا ہے؟

۵ .تعلیم وتربیت کو ایک بنیادی معاشرتی حق کیوں قرار دیا گیا ہے؟

۶ .نیکی اور بھلائی میں تعاون (تعاون علی البر) کا آفاقی مفہوم بیان کیجیے۔

۷ .امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا دائرہ فرد سے لے کر ریاست تک کیسے پھیلتا ہے؟

۸ .معاشرتی خدمت اور فلاحی جذبے کی روحانی اہمیت کیا ہے؟

۹ .جدید معاشرتی بحران کے بنیادی اسباب کون سے ہیں؟

۱۰ .اسلام اور انسانی حقوق کے عالمی منشور کے مابین فرق کو واضح کیجیے۔

۱۱ .آپ کے نزدیک ایک ذمہ دار شہری کے فرائض کن تین پہلوؤں میں سمٹے ہوئے ہیں؟

یونٹ:8

سوشل میڈیا کا استعمال: آداب و ضوابط

مصنف: ڈاکٹر محمود احمد

نظرِ ثانی: ڈاکٹر حامد حماد

فہرست عنوانات

یونٹ:8 137

سوشل میڈیا کا استعمال: آداب وضوابط 137

مصنف: ڈاکٹر محمود احمد 137

نظرِ ثانی: ڈاکٹر حامد حماد 137

یونٹ کا تعارف 140

یونٹ کے مقاصد 141

1- عصرِ حاضر میں سوشل میڈیا کی اہمیت 142

2- سوشل میڈیا اور اخلاقی ابلاغ: جامع اصول 143

2.1 سچائی، تحقیق اور شفافیت (Truth, Verification & Transparency) ... 143

2.2 احترامِ انسانیت اور خیر خواہی (Respect & Benevolence) 144

2.3- شائستگی اور نرمیِ بیان (Courtesy & Civility) 145

2.4- ضبطِ نفس، توازن اور مقصدیت 146

(Self-restraint, Balance & Purposefulness 146

2.5- جواب دہی اور امانت داری (Accountability & Responsibility) 147

2.6- رازداری اور امانتِ معلومات (Privacy & Confidentiality) 149

2.7- خود نمائی اور شہرت پسندی سے اجتناب (Avoiding Vanity & Self-projection) 150

2.8- نفرت، تعصب اور گروہی تقسیم سے پرہیز (Avoiding Hate & Bias) 151

2.9- سماجی خیر اور تعمیری ابلاغ 153
(Constructive & Beneficial Communication 153
3-سوشل میڈیا کے چیلنجز اور ان کا حل 154
3.1- فیک نیوز اور غلط معلومات 154
3.2- فراڈ، دھوکا دہی اور استحصال 155
3.3- تشدد، نفرت اور عدم رواداری 155
3.4- شہرت کی دوڑ اور ذہنی دباؤ 155
4-خلاصہ 156
خود آزمائی 156

یونٹ کا تعارف

عصرِ حاضر میں انسان کی زندگی ابلاغ کے ایسے ذرایع سے وابستہ ہو چکی ہے جنھوں نے فکر، تعلق اور اثر کے تمام زاویے بدل دیے ہیں۔ ان ذرایع نے دنیا کو ایک گلوبل گاؤں میں بدل دیا ہے جہاں فاصلے سمٹ گئے اور آوازیں قریب آگئی ہیں۔ سوشل میڈیا نے انسان کو اظہار اور رابطے کی بے مثال آزادی دی ہے، بل کہ اس کے ساتھ یہ نئی ذمہ داری بھی پیدا کر دی ہے کہ وہ اپنے الفاظ، آرا اور رویوں کو اخلاقی معیار کے تابع رکھے۔

یہ وہ دنیا ہے جہاں ہر شخص خود بھی ابلاغ کا ذریعہ بن چکا ہے۔ اس کی ہر بات، تحریر اور تصویر اب ایک اخلاقی ذمہ داری کی حیثیت رکھتی ہے۔ انسان کا ایک تبصرہ، ایک جملہ یا ایک تصویر محض ذاتی راے نہیں رہتی بل کہ اجتماعی ماحول پر اثر انداز ہونے والا عمل بن جاتی ہے۔

سوشل میڈیا کے صحیح استعمال کے لیے ضروری ہے کہ آزادی اور ذمہ داری کے درمیان توازن قائم رکھا جائے۔ ابلاغ کا مقصد نفع رسانی، خیر خواہی اور باہمی احترام ہونا چاہیے، نہ کہ شہرت، غلبہ یا دوسروں کی تحقیر۔ یہی وہ آفاقی اخلاقی اصول ہیں جو ہر مہذب معاشرت کی بنیاد ہیں اور جن کی تائید تمام آسمانی تعلیمات کرتی ہیں۔ قرآنِ مجید نے اسی حقیقت کو ان الفاظ میں سمیٹا ہے: ''وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا'' **(البقرہ، 2:83)** یعنی ''لوگوں سے بھلائی کی بات کہو۔''

یہ اصول موجودہ ڈیجیٹل دنیا میں بھی اتنا ہی سچا ہے جتنا انسانی معاشرت کی ابتدا میں تھا۔

یہ یونٹ سوشل میڈیا کے استعمال سے متعلق انھی بنیادی اخلاقی اصولوں کا مطالعہ پیش کرے گا۔ اس میں یہ دیکھا جائے گا کہ سوشل میڈیا کے ابلاغ میں سچائی، دیانت، خیر خواہی اور احترامِ انسانیت کے تقاضے کس طرح پورے کیے جا سکتے ہیں۔ نیز یہ بھی زیرِ بحث آئے گا کہ نفرت انگیز مواد، جعلی خبروں اور شہرت پسندی جیسے رجحانات سے بچنے کے لیے فرد اپنے رویے میں ضبط، توازن اور ذمہ داری کیسے پیدا کرے۔

یونٹ کے مقاصد

امید ہے کہ اس یونٹ کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1. سوشل میڈیا کی نوعیت، اثرات اور اس کے ابلاغی کردار کو اخلاقی نقطۂ نظر سے سمجھ سکیں۔
2. سوشل میڈیا میں آزادیِ اظہار اور اخلاقی ذمہ داری کے درمیان توازن قائم کرنے کے اصول سیکھ سکیں۔
3. ابلاغ میں سچائی، دیانت، خیر خواہی اور احترامِ انسانیت کے بنیادی ضوابط کو پہچان سکیں۔
4. جعلی خبروں، نفرت انگیز مواد اور شہرت پسندی جیسے منفی رجحانات کی پہچان کر کے ان سے بچنے کے طریقے اختیار کر سکیں۔
5. اسلامی تعلیمات کی روشنی میں سوشل میڈیا کے استعمال کے آداب و ضوابط پر عمل کی بصیرت حاصل کر سکیں۔
6. اپنے ڈیجیٹل رویے میں ضبطِ نفس، شائستگی اور باہمی احترام جیسی اقدار کو فروغ دے سکیں۔
7. خود احتسابی، ذمہ داری اور نفع رسانی کے جذبے کے ساتھ سوشل میڈیا کو مثبت سماجی خدمت کے وسیلے کے طور پر استعمال کر سکیں۔

1-عصرِ حاضر میں سوشل میڈیا کی اہمیت

سماج کے ارتقا میں ابلاغ کی ہمیشہ مرکزی حیثیت رہی ہے لیکن موجودہ عہد میں یہ محض ایک ذریعہ نہیں رہا بل کہ انسانی فکر، رویے اور تعلقات کا سب سے مؤثر محرک بن چکا ہے۔ ڈیجیٹل ٹیکنالوجی نے ابلاغ کی رفتار کو اس درجہ تیز کر دیا ہے کہ لمحوں میں ایک خبر، خیال یا تصویر پوری دنیا تک پہنچ جاتی ہے۔ آج سوشل میڈیا نے فرد کو اجتماعی سطح پر وہ قوت عطا کر دی ہے جو کبھی بڑے اداروں یا حکومتوں کے پاس ہوا کرتی تھی۔ اب ایک عام انسان بھی اپنی رائے، احساس یا احتجاج سے عالمی مکالمے کا حصہ بن سکتا ہے۔

اس طاقت نے جہاں معلومات، تعلیم اور شعور کے دروازے کھولے ہیں وہیں نئے اخلاقی و فکری بحران بھی پیدا کیے ہیں۔ غلط معلومات، نفرت انگیزی اور سستی شہرت کے رجحانات نے سوشل میڈیا کو ایک ایسی دو دھاری تلوار بنا دیا ہے جو ایک طرف خیر و نفع کا ذریعہ ہے اور دوسری طرف فساد و انتشار کا سبب بن سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دورِ حاضر میں ''ڈیجیٹل اخلاقیات (Digital Ethics) ''کی بحث صرف تکنیکی نہیں بل کہ اخلاقی اور تہذیبی مسئلہ بن چکی ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ابلاغ کا اصل مقصد خیر، عدل اور صداقت کا فروغ ہے۔ قرآنِ مجید انسان سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ'' قولِ سدید ''اختیار کرے یعنی بات ایسی ہو جو سچی، متوازن اور اصلاح پر مبنی ہو۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''مَن كانَ يُؤمِنُ باللهِ وَاليومِ الآخِرِ فليقُل خيرًا أو ليصمُت''(صحیح بخاری کتاب الأدب حدیث6136)

''جو شخص اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ بھلی بات کہے یا خاموش رہے۔''

یہی اصول ڈیجیٹل عہد کے لیے بھی رہ نما ہے کیوں کہ اب ہر شخص کے ہاتھ میں ایک ایسا آلہ ہے جو خیر کے پیغام کو عام بھی کر سکتا ہے اور فتنہ و فساد کو بھی۔

یوں سوشل میڈیا محض ایک مواصلاتی وسیلہ نہیں رہا بل کہ اخلاقی تربیت اور اجتماعی شعور کا پیمانہ بن چکا ہے۔ اگر اسے ذمہ داری، دیانت اور ضبطِ نفس کے ساتھ استعمال کیا جائے تو یہ علم و ہدایت کی نئی دنیا آباد کر سکتا ہے

لیکن اگر اسے جذبات، مفادات یا خود نمائی کا آلہ بنا دیا جائے تو یہی طاقت انسانیت کے لیے خطرہ بن جاتی ہے۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ اس عہد کے ابلاغی ذرائع کے ساتھ ساتھ اس کے اخلاقی اصولوں کو بھی سمجھا اور اپنایا جائے تاکہ ڈیجیٹل دنیا بھی انسان کی روحانی و اخلاقی تعمیر کا ذریعہ بنے نہ کہ اس کے زوال کا میدان۔

2- سوشل میڈیا اور اخلاقی ابلاغ: جامع اصول

ڈیجیٹل دنیا میں ابلاغ محض معلومات کی ترسیل نہیں رہا بل کہ ایک اخلاقی عمل بن چکا ہے، ایسا عمل جو انسان کی نیت، فکر اور کردار کا آئینہ دار ہے۔ سوشل میڈیا نے اظہار کی آزادی کو بے پناہ وسعت دی ہے مگر اسی کے ساتھ اس نے اخلاقی ذمہ داری کو بھی کئی گنا بڑھا دیا ہے۔ اب ہر پیغام، ہر تبصرہ، ہر تصویر نہ صرف ایک رائے بل کہ ایک اخلاقی شہادت (moral testimony) کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ابلاغ کے ہر عمل کی بنیاد ایسے اصولوں پر رکھی جائے جو سچائی، انصاف، احترامِ انسانیت اور خیر خواہی کے ضامن ہوں۔

عالمی سطح پر جن ضوابط کو "Digital Ethics" یا "Responsible Communication" کے عنوان سے تسلیم کیا جا رہا ہے وہ دراصل انہی اخلاقی بنیادوں کا جدید اظہار ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو یہی اصول اسلام کی بنیادی تعلیمات میں صدیوں پہلے سے موجود ہیں، "قولِ عدل"، "قولِ سدید" اور "امر بالمعروف" کی صورت میں۔

یوں سوشل میڈیا کا درست استعمال تبھی ممکن ہے جب فرد اپنی آن لائن سرگرمی کو عبادت، خدمت اور خیر کے ایک مقصد سے جوڑ لے۔

2.1 سچائی، تحقیق اور شفافیت (Truth, Verification & Transparency)

ڈیجیٹل دنیا میں معلومات کا بہاؤ اس قدر تیز ہو چکا ہے کہ سچ اور جھوٹ کی تمیز اکثر دھندلا جاتی ہے۔ سوشل میڈیا نے ہر فرد کو خبر رساں بنا دیا ہے، اس لیے ابلاغ میں تحقیق (verification) اور شفافیت (transparency) اب صرف اخلاقی نہیں بل کہ تہذیبی ضرورت بن چکی ہے۔ جدید عالمی ادارے جیسے یونیسکو اور ورلڈ اکنامک فورم اپنے "Digital Ethics Frameworks" میں اس بات پر زور

دیتے ہیں کہ آن لائن پیغام رسانی کا پہلا اصول سچائی اور ذمہ داری ہے۔ "Verify before you share" اور "Think before you post" جیسی تعبیرات اسی بیداری کی علامت ہیں۔

اسلامی تعلیمات میں یہی اصول نہایت وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ قرآنِ مجید فرماتا ہے:

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا" (الحجرات:6)

یعنی "اے ایمان والو! اگر کوئی بدکار تمھارے پاس کوئی خبر لائے تو تحقیق کر لو۔"

رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

"كَفَىٰ بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ" (مسلم، حدیث 5)

"آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی ہوئی بات بیان کرتا پھرے۔"

یہ اصول ہمیں یاد دلاتا ہے کہ جھوٹ صرف گھڑنا نہیں بل کہ غیر مصدقہ بات پھیلانا بھی ایک اخلاقی خیانت ہے۔ سوشل میڈیا پر کوئی بھی غیر تحقیق شدہ اطلاع، غلط تاثر یا مبالغہ آمیز رائے معاشرتی فتنہ، بے اعتمادی اور انتشار کو جنم دیتی ہے۔ اس کے برعکس جب انسان اپنی گفت گو، تبصرے اور شیئر کردہ مواد کو دیانت، وضاحت اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ پیش کرتا ہے تو وہ نہ صرف ابلاغ میں سچائی کی روایت قائم کرتا ہے بل کہ اعتماد اور خیر خواہی کے رشتوں کو بھی مضبوط بناتا ہے۔

2.2 احترامِ انسانیت اور خیر خواہی (Respect & Benevolence)

سوشل میڈیا نے انسانی مکالمے کو بیک وقت مقامی اور عالمی سطح پر جوڑ دیا ہے۔ اب ایک فرد کی بات صرف چند لوگوں تک محدود نہیں رہتی بل کہ سیکڑوں اور ہزاروں اذہان پر اثر ڈالتی ہے۔ اس وسعت نے ابلاغ کو محض رائے کے اظہار سے بڑھا کر انسانی تعلق اور اخلاقی شعور کا مظہر بنا دیا ہے۔ ایسے ماحول میں احترامِ انسانیت اور خیر خواہی وہ بنیادیں ہیں جو ایک مہذب ڈیجیٹل معاشرت کو قائم رکھتی ہیں۔

عالمی اخلاقی ضوابط جیسے United Nations Digital Compact اور UNESCO's Recommendation on the Ethics of Artificial Intelligence اس بات پر متفق ہیں کہ ہر ڈیجیٹل رابطہ "انسانی وقار (Human Dignity)"

اور ''رحم واحترام (Compassion & Respect) '' کے اصول پر استوار ہونا چاہیے۔ ابلاغ کا مقصد کسی فرد یا گروہ کی تضحیک، تحقیر یا محرومی نہیں بل کہ فکری و سماجی ہم آہنگی کا فروغ ہے۔ جدید ماہرینِ سماجیات بھی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ''Digital Empathy'' یعنی آن لائن ہمدردی، ڈیجیٹل کلچر کی بقا کے لیے ناگزیر ہے۔

تمام تہذیبوں میں، خواہ وہ مشرقی ہوں یا مغربی، یہ اصول مشترک رہا ہے کہ انسان کا احترام اس کی رائے، زبان، نسل یا عقیدے سے بالاتر ہے۔ بودھ مت میں اہنسا (عدم ایذا) کا تصور، عیسائیت میں Love thy neighbor کی تعلیم، اور اسلامی روایت میں حرمتِ انسان کا نظریہ، یہ سب اسی آفاقی اخلاقی بصیرت کے مختلف مظاہر ہیں۔ قرآنِ مجید میں ارشاد ہے:

''وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ''(الإسراء:70)

یعنی ''ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی۔''

یہ اعلان دراصل تمام انسانیت کے احترام کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ یوں ڈیجیٹل دنیا میں بھی اخلاقی ابلاغ کا اصل معیار یہی ہے کہ ہر اظہار میں دوسروں کے وقار، احساسات اور سلامتی کا خیال رکھا جائے۔ اختلافِ رائے کو دشمنی میں بدلنے کے بجائے سمجھ اور خیر خواہی کا ذریعہ بنایا جائے۔ اگر انسان اپنے الفاظ اور طرزِ اظہار کو عزتِ آدمیت کے احترام کے تابع رکھے تو وہ اس عہدِ ابلاغ میں صرف ایک صارف نہیں رہتا بل کہ انسانی تہذیب کا معمار بن جاتا ہے۔

2.3-شائستگی اور نرمیِ بیان (Courtesy & Civility)

تمدن کی بنیاد صرف علم اور فن پر نہیں بل کہ اخلاق اور طرزِ گفت گو پر استوار ہوتی ہے۔ زبان انسان کی شخصیت کا آئینہ ہے، وہ جیسا بولتا ہے ویسا ہی درحقیقت سوچتا اور جیتا ہے۔ سوشل میڈیا نے اظہار کے دروازے سب کے لیے کھول دیے ہیں لیکن اس آزادی کے ساتھ ایک نئی آزمایش بھی پیدا ہو گئی ہے کہ انسان اپنی رائے دیتے ہوئے ادب، توازن اور احترام کو کس حد تک قائم رکھتا ہے۔

دنیا کی بڑی تہذیبوں اور دانش گاہوں نے ہمیشہ یہ تسلیم کیا ہے کہ گفت گو کی شایستگی ہی عقل و دانش کی دلیل ہے۔ یونیسکو کے "Declaration on Tolerance" میں صاف کہا گیا ہے کہ "بردباری اور شایستگی مکالمے کو تصادم سے بچاتی اور فہم و تعاون کو بڑھاتی ہے۔" یہی اصول آج کی ڈیجیٹل دنیا پر بھی صادق آتا ہے۔ اگر اظہارِ رائے اشتعال، طنز یا تمسخر کا لبادہ اوڑھ لے تو وہ علم نہیں بل کہ تعصب بن جاتا ہے اور ایسا ابلاغ خیر کے بجائے فساد کو جنم دیتا ہے۔

یہی اخلاقی منہاج تمام مذاہب اور مکاتبِ فکر میں مشترک رہا ہے۔ بودھ مت میں نرمیِ گفتار کو روح کی طہارت کا مظہر سمجھا گیا، عیسائیت نے "Gentle answer turns away wrath" کی تعلیم دی، اور اسلامی روایت نے "قولًا لینًا" یعنی نرم بات کو انبیائی طرزِ خطاب قرار دیا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"اَلْمُؤْمِنُ لَیْسَ بِالطَّعَّانِ وَلَا اللَّعَّانِ وَلَا الْفَاحِشِ وَلَا الْبَذِیءِ" (ترمذی، حدیث 1977)

"مؤمن نہ بدزبان ہوتا ہے نہ طعنہ دینے والا، نہ فحش گو اور نہ بدکلام۔"

یہ تعلیم دراصل وہی آفاقی اصول ہے جو ہر مہذب معاشرت کے ضمیر میں موجود رہا ہے۔ سوشل میڈیا کے ابلاغ میں اگر انسان اپنی بات کو شایستگی، متانت اور سنجیدگی کے ساتھ پیش کرے تو اختلاف بھی احترام میں بدل جاتا ہے۔ اس کا ہر لفظ دلوں میں بھڑک نہیں بل کہ روشنی پیدا کرتا ہے۔ نرمیِ بیان کمزوری نہیں بل کہ ضبط، وقار اور فکری پختگی کی علامت ہے۔ یہی طرزِ گفت گو دراصل انسان کی تعمیرِ شخصیت کا سنگِ بنیاد ہے۔

2.4- ضبطِ نفس، توازن اور مقصدیت

(Self-restraint, Balance & Purposefulness)

انسان کی تہذیب کا اصل امتحان اُس کی قوتِ اظہار میں نہیں بل کہ اُس کے ضبطِ اظہار میں ہے۔ آزادی اگر ضبط کے بغیر ہو تو فساد بن جاتی ہے اور رائے اگر توازن سے خالی ہو تو انتشار پیدا کرتی ہے۔ سوشل میڈیا کے اس ہنگامہ خیز عہد میں، جہاں ہر شخص لمحوں میں اپنی بات دنیا تک پہنچا سکتا ہے، وہاں سب سے بڑی ضرورت یہی ہے کہ انسان اپنے جذبات، وقت اور الفاظ پر قابو رکھنا سیکھے۔

یہی وصف، ضبطِ نفس، تمام تہذیبوں کے نزدیک اخلاقی برتری کی علامت رہا ہے۔ یونانی حکما نے اسے

''Temperance'' کہا اور اخلاقِ اربعہ میں شامل کیا؛ بودھ مت نے ''مدھیما پتھی (Middle Path) کو نجات کی راہ بتایا؛ اور جدید اخلاقی فلسفے میں اسے ''Emotional Regulation'' اور ''Digital Discipline'' کے عنوان سے بیان کیا جاتا ہے۔ غرض، انسان کا وقار اسی میں ہے کہ وہ اپنی قوتِ اظہار کو توازن اور مقصد کے تابع رکھے۔

اسلامی تعلیمات نے اسی اصول کو نہایت جامع انداز میں پیش کیا ہے۔ قرآنِ مجید میں ارشاد ہے:

''وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ'' (آلِ عمران:134)

''اور وہ جو غصہ ضبط کر لیتے ہیں اور لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں، اور اللہ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

رسولِ اکرم ﷺ نے بھی اس خلقِ ضبط کو ایمان کی علامت قرار دیا۔ فرمایا:

لَيسَ الشَّدِيدُ بِالصُّرَعَةِ، إِنَّمَا الشَّدِيدُ الَّذِي يَمْلِكُ نَفسَهُ عِندَ الغَضَبِ.

(صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب الحذر من الغضب)

''طاقت ور وہ نہیں جو دوسرے کو پچھاڑ دے بل کہ وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے۔''

یہی وہ ضبط و توازن ہے جو انسان کے کردار کو سنوارتا اور اس کے ابلاغ کو بامقصد بناتا ہے۔ سوشل میڈیا کی دنیا میں ضبطِ نفس کا مطلب یہ ہے کہ انسان ہر خبر یا تبصرے پر فوری ردِ عمل دینے کے بجائے سوچے، تولے اور پھر بولے۔ وہ اپنی آن لائن موجودگی کو وقتی جذبات کے بجائے علم، خیر اور تعمیرِ سماج کے تابع کرے۔

جو شخص اپنے وقت اور لہجے پر قابو پاتا ہے وہ اپنے ابلاغ کو عبادت بنا لیتا ہے۔ ضبطِ نفس دراصل خود پر حکومت کرنے کا فن ہے اور یہی فن انسان کو آزادی کے ہجوم میں وقار عطا کرتا ہے۔ یہی توازن اور مقصدیت وہ چراغ ہے جو ڈیجیٹل عہد کی اندھیری راہوں کو منور کر سکتا ہے۔

2.5- جواب دہی اور امانت داری (Accountability & Responsibility)

انسان کی اخلاقی عظمت اسی وقت ظاہر ہوتی ہے جب وہ اپنی آزادی کے ساتھ جواب دہی کا احساس بھی رکھے۔ ابلاغ کی دنیا میں جس قدر طاقت بڑھتی ہے اسی قدر ذمہ داری بھی بڑھ جاتی ہے۔ سوشل میڈیا نے فرد کو یہ اختیار دے دیا ہے کہ وہ ایک لمحے میں سینکڑوں ذہنوں کو متاثر کر سکتا ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ سوال بھی پیدا

ہوتا ہے کہ وہ اپنے لفظ، تصویر اور عمل کے اثرات کے لیے کتنا ذمہ دار ہے۔

تمام عالمی اخلاقی منشورات، خواہ وہ UNESCO's Media and Information Literacy Framework ہو یا World Economic Forum's Global Principles of Digital Responsibility، اس بات پر متفق ہیں کہ ڈیجیٹل ابلاغ میں ہر فرد اپنی گفت گو، رویے اور اثرات کا ذمہ دار ہے۔ جواب دہی کا مطلب صرف قانونی احتساب نہیں بل کہ یہ ایک اخلاقی بیداری ہے کہ انسان ہر لفظ کی جواب دہی سب سے پہلے اپنے ضمیر اور پھر خالقِ کائنات کے سامنے کرے گا۔

یہی وہ اصول ہے جسے تمام آسمانی تعلیمات نے مشترکہ طور پر تسلیم کیا ہے۔ قرآنِ مجید میں انسان کو تنبیہ کی گئی:

"مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ" (ق:18)

"انسان کوئی بات زبان سے نہیں نکالتا مگر ایک نگہبان اس پر موجود ہوتا ہے جو لکھنے کو تیار رہتا ہے۔"

اور رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

"كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ" (صحیح البخاری، کتاب الأحکام، باب قول الإمام للوفد)

"تم میں سے ہر شخص نگہبان ہے اور ہر ایک سے اس کی ذمہ داری کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔"

یہ تعلیم دراصل امانت داری کا خلاصہ ہے۔ امانت صرف مال و دولت کی نہیں بل کہ علم، الفاظ، تصاویر اور معلومات کی بھی ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص غیر مصدقہ خبر پھیلاتا ہے، کسی کی نجی بات عام کر دیتا ہے یا کسی کی شہرت کو نقصان پہنچاتا ہے تو وہ دراصل امانت میں خیانت کرتا ہے۔

سوشل میڈیا کے دور میں جواب دہی کا مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنی آن لائن سرگرمی کو دیانت، شفافیت اور خیر خواہی کے تابع رکھے۔ جو بات وہ شیئر کرتا ہے، کیا وہ سچ ہے؟ کیا وہ کسی کو نقصان تو نہیں پہنچائے گی؟ کیا وہ اصلاح کے بجائے فساد تو نہیں پھیلائے گی؟ یہی سوالات ایک ذمہ دار شہری اور مہذب انسان کی پہچان ہیں۔

اگر معاشرے کے افراد اپنی گفت گو میں امانت اور جواب دہی کو شعار بنالیں تو ڈیجیٹل دنیا شور نہیں بل کہ شعور میں بدل سکتی ہے۔ یہی اصول تعمیرِ شخصیت کا جوہر ہے، کہ انسان خود کو محاسبہ کے پیمانے پر پرکھے اور اپنے ہر لفظ کو امانت سمجھے جو ایک دن لوٹ کر پیش کرنا ہے۔

2.6- رازداری اور امانتِ معلومات (Privacy & Confidentiality)

تمدن کی بنیاد اعتماد پر ہے اور اعتماد کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ انسان ایک دوسرے کے راز، نجی زندگی اور اعتماد کو محفوظ رکھے۔ سوشل میڈیا کے اس دور میں جہاں ہر شخص کے الفاظ، تصاویر اور احساسات دنیا کے سامنے آجاتے ہیں، رازداری اب محض ایک سماجی تقاضا نہیں بل کہ ایک اخلاقی فریضہ بن چکی ہے۔

بین الاقوامی ضوابط مثلاً UN's Universal Declaration of Human Rights (آرٹیکل 12) اور General Data Protection Regulation (GDPR) اس بات کو بنیادی انسانی حق قرار دیتے ہیں کہ ہر شخص کی نجی معلومات، شناخت اور تعلقات کا تحفظ کیا جائے۔ کسی کی ذاتی تصویر، پیغام یا شناخت کو اُس کی اجازت کے بغیر عام کرنا اس حق کی صریح خلاف ورزی ہے۔ جدید دنیا اسے Privacy Breach کہتی ہے، مگر دراصل یہ ایک اخلاقی خیانت ہے جو انسانی شرافت کے منافی ہے۔

تمام مذاہب و تہذیبوں نے رازداری کو انسانیت کے لازمی اصولوں میں شمار کیا ہے۔ ہندو دھرم میں گُپت دھرم (خفیہ بھلائی) کا تصور، عیسائیت میں "Do not bear false witness" کی تعلیم، اور اسلامی ہدایت میں "امانت" اور "سترِ عیب" کا تصور، سب اسی ایک اصول کی گواہی دیتے ہیں۔ قرآنِ مجید میں فرمایا گیا:

"وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُم بَعْضًا" (الحجرات:12)

"اور ایک دوسرے کی جاسوسی نہ کرو اور نہ کوئی کسی کی غیبت کرے۔"

اور رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

"مَن سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ" (صحیح مسلم، کتاب البرّ والصلة، باب من ستر مسلماً)

''جس نے کسی مسلمان کے عیب پر پردہ ڈالا، اللہ اس پر دنیا و آخرت میں پردہ ڈالے گا۔''

یہ تعلیمات کسی ایک مذہب تک محدود نہیں بل کہ تمام مہذب معاشروں کے ضمیر میں گونجتی ہیں۔ سوشل میڈیا کے ابلاغ میں رازداری کا مطلب یہ ہے کہ ہم کسی کی نجی زندگی، خاندان، پیغامات یا ذاتی معلومات کو تماشا نہ بنائیں۔ کسی کی اجازت کے بغیر اس کے ڈیٹا یا تصویر کا اشتراک نہ کریں۔ اعتماد ایک مقدس امانت ہے، اور جو قوم اس کی حفاظت کھو دیتی ہے، وہ اپنے اخلاقی وجود سے محروم ہو جاتی ہے۔

اس عہدِ ڈیجیٹل میں امانتِ معلومات کا مطلب یہ ہے کہ ہم دوسروں کی نجی حدود کی حرمت کا احترام کریں۔ اگر انسان اپنی زبان اور اپنی انگلیوں دونوں پر ضبط رکھے تو دنیا کے تمام ڈیجیٹل شور کے باوجود اُس کی شخصیت سے سکون، امن اور اعتماد پھوٹے گا۔ یہی رازداری دراصل تہذیب کی حفاظت کا پہرہ ہے، اور یہی امانت انسانیت کی بقا کی ضمانت۔

2.7- خود نمائی اور شہرت پسندی سے اجتناب

(Avoiding Vanity & Self-projection)

انسان کی فطرت میں پہچان اور قدر و منزلت کی خواہش رکھی گئی ہے لیکن جب یہی جذبہ خدمت اور اخلاص سے نکل کر خود نمائی اور شہرت پسندی میں ڈھل جائے تو اخلاقی زوال کا آغاز ہو جاتا ہے۔ سوشل میڈیا نے انسان کو اظہار کی بے مثال قوت دی ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ خطرہ بھی پیدا کر دیا ہے کہ وہ اپنی ذات کو محور بنا لے اور ہر عمل کا مقصد محض نمائش اور تعریف بن جائے۔

عالمی سطح پر اخلاقی ماہرین اس رجحان کو ''Digital Narcissism'' یا ''Self-branding Culture'' کے نام سے تعبیر کرتے ہیں جو جدید انسان کے شعور میں اخلاقی خالی پن پیدا کر رہی ہے۔ اقوامِ متحدہ کے ذیلی فورمز اور یونیسکو کے ''Ethics of Social Media Use'' جیسے دستاویزات اس بات پر زور دیتے ہیں کہ آن لائن اظہار کو self-promotion کے بجائے social contribution کا ذریعہ بنایا جائے۔

دنیا کی ہر بڑی تہذیب نے عاجزی کو بلندی اور فخر کو پستی سمجھا ہے۔ بودھ مت نے ''Ego-

: "Blessed are the meek, for they کو نجات کا زینہ بتایا، عیسائیت نے فرمایا lessness"
shall inherit the earth." اور اسلام نے تکبر وریا کو باطن کی بیماری قرار دیا۔ قرآنِ مجید میں ارشاد ہے:

"فَلَا تُزَكُّوا أَنفُسَكُمْ ۖ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَىٰ" (النجم:32)

"پس اپنی پاکیزگی کا دعویٰ نہ کرو، وہ (اللہ) خوب جانتا ہے کہ کون متقی ہے۔"

اور رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

"مَن تَوَاضَعَ لِلَّهِ رَفَعَهُ اللَّهُ" (سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، باب التواضع)

"جو شخص اللہ کے لیے عاجزی اختیار کرتا ہے، اللہ اسے بلند کر دیتا ہے۔"

یہ تعلیمات اس بات کا اعلان ہیں کہ اصل قدر نمائش میں نہیں بل کہ خدمت، خلوص اور سکونِ باطن میں ہے۔ سوشل میڈیا کے ماحول میں جہاں ہر شخص خود کو دکھانے میں مصروف ہے وہاں اخلاقی بلندی یہ ہے کہ انسان اپنی نیت کو خالص رکھے، اپنی بات کو نفعِ عام کے لیے پیش کرے اور اپنی ذات کو مقصد کے بجائے ذریعہ سمجھے۔

خود نمائی انسان کے شعور کو کھوکھلا کر دیتی ہے جب کہ اخلاص اسے وقار اور وزن عطا کرتا ہے۔ جو شخص اپنی بات کو اللہ، انسانیت اور خیر کے لیے کہتا ہے اُس کے الفاظ میں اثر بھی ہوتا ہے اور برکت بھی۔ مگر جو شخص محض تعارف اور داد کا طلبگار ہو، اس کی گفت گو جلد بھلا دی جاتی ہے۔ یوں سوشل میڈیا کے اس شور میں خاموش خدمت کرنے والا وہی شخص دراصل سب سے نمایاں ہوتا ہے کیوں کہ وہ اپنی نیت کے اخلاص سے پہچانا جاتا ہے، نہ کہ فالوورز کی گنتی سے۔

2.8- نفرت، تعصب اور گروہی تقسیم سے پرہیز (Avoiding Hate & Bias)

انسانی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ یہ رہا ہے کہ علم وابلاغ کے ذرائع، جن کا مقصد باہمی فہم واتحاد تھا، اکثر تعصب، نفرت اور تقسیم کا آلہ بن گئے۔ جدید سوشل میڈیا نے بھی انسان کو ایک وسیع عالمی برادری کا حصہ تو بنا دیا ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ خطرہ بڑھ گیا ہے کہ اختلافِ رائے دشمنی میں بدل جائے اور تنوعِ خیال انتشار میں ڈھل جائے۔

اقوامِ متحدہ، یونیسکو اور یورپی یونین جیسے ادارے اپنی ابلاغی پالیسیوں میں بار بار اس بات پر زور دیتے ہیں

کہ نفرت انگیز تقریر (Hate Speech) اور متعصبانہ مواد (Biased Content) محض اخلاقی نہیں بل کہ انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے۔ یونیسکو کے "Guidelines for Regulating Digital Platforms" کے مطابق کسی مذہب، نسل، زبان یا قوم کے خلاف تحقیر آمیز مواد نہ صرف سماجی زہر ہے بل کہ عالمی امن کے لیے خطرہ بھی۔

تمام مہذب مذاہب اور تہذیبوں نے اس اصول پر اتفاق کیا ہے کہ انسانوں کے درمیان اختلاف فطری ہے مگر دشمنی اختیاری۔ بدھ مت نے "Karuna" (رحم) اور "Metta" (محبت) کو نجات کا راستہ بتایا؛ عیسائیت نے "Love your enemies" کی تعلیم دی اور اسلام نے عدل و انصاف کو تمام تعلقات کی بنیاد قرار دیا۔ قرآنِ مجید میں ارشاد ہے:

"وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ" (المائدہ:8)

"کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف نہ کرو۔ انصاف کرو، یہی تقویٰ سے قریب تر ہے۔"

اور نبیِ کریم ﷺ نے فرمایا:

"لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبْرٍ" (صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب تحریم الکبر)

"جس کے دل میں ذرّہ برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔"

یہ تعلیم دراصل انسان کے باطن سے نفرت اور تعصب کی جڑ کاٹ دیتی ہے، کیوں کہ تکبر ہی وہ بیج ہے جس سے نفرت، امتیاز اور گروہ بندی پھوٹتی ہے۔ سوشل میڈیا کے عہد میں یہ اخلاقی ذمہ داری پہلے سے بڑھ گئی ہے کہ انسان اپنے الفاظ، تبصروں اور شیئر کردہ مواد میں تعصب سے پاک رہے۔

اگر ہم اختلاف کو دشمنی کے بجائے مکالمے کا دروازہ سمجھ لیں تو یہی تنوع ہماری طاقت بن سکتا ہے۔ نفرت کی زبان دلوں کو بند کرتی ہے، جب کہ عدل اور احترام کی زبان قوموں کو جوڑتی ہے۔ سوشل میڈیا کو تعمیری مکالمے اور عالمی رواداری کا ذریعہ بنانا ہی وہ قدم ہے جو انسانی تہذیب کو نفرت سے نجات اور امن سے ہم آہنگی کی طرف لے جاسکتا ہے۔

2.9- سماجی خیر اور تعمیری ابلاغ

Constructive & Beneficial Communication)

انسانی معاشرت کی اصل روح خیر، تعاون اور تعمیر میں مضمر ہے۔ اگر ابلاغ اس خیر کے جذبے سے خالی ہو جائے تو وہ صرف الفاظ کا شور بن جاتا ہے۔ سوشل میڈیا کے اس دور میں جہاں ہر فرد کے پاس اظہار کا پلیٹ فارم ہے، وہاں اصل سوال یہ ہے کہ کیا یہ اظہار انسانیت کی فلاح کے لیے ہے یا محض وقت گزاری اور جذبات انگیزی کے لیے؟

جدید عالمی ادارے، خصوصاً United Nations Alliance of Civilizations (UNAOC) اور UNESCO's Global Citizenship Education Framework، اس بات پر متفق ہیں کہ ابلاغ کا بنیادی مقصد انسانی بہبود، باہمی تعاون اور معاشرتی ہم آہنگی کو فروغ دینا ہے۔ "Responsible Digital Citizenship" کا تصور اسی شعور کا تسلسل ہے، کہ ہر صارف اپنی آن لائن سرگرمی کو خیرِ عامہ (Common Good) کے تابع رکھے۔

دنیا کی تمام تہذیبوں میں یہی تعلیم بار بار دہرائی گئی ہے کہ زبان، علم اور رائے انسان کی خدمت کے لیے ہیں، اس کی تباہی کے لیے نہیں۔ قدیم چینی فلسفے میں "Ren" یعنی انسانی خیر خواہی کو اخلاق کا مرکز قرار دیا گیا، بودھ مت میں "Karuna" یعنی رحم، اور عیسائیت میں "Do unto others as you would have them do unto you" کو سنہری اصول مانا گیا۔

قرآنِ مجید نے اس آفاقی اخلاقی پیغام کو نہایت جامع انداز میں بیان کیا:

"وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا" (البقرہ: 83)

"اور لوگوں سے بھلائی کی بات کہو۔"

اور نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

خَيْرُ النَّاسِ أَنْفَعُهُمْ لِلنَّاسِ. (المعجم الأوسط للطبرانی، حدیث 5937)

"لوگوں میں سب سے بہتر وہ ہے جو دوسروں کے لیے زیادہ نفع بخش ہو۔"

یہی وہ اخلاقی نصب العین ہے جو ابلاغ کو تعمیری اور انسان کو مفید بناتا ہے۔ سوشل میڈیا کے میدان میں تعمیری ابلاغ کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی راے اور معلومات کو اس طرح استعمال کرے کہ وہ علم، خیر، امید اور اصلاح کو عام کرے۔ منفی تبصرے، جھوٹی خبریں اور فتنہ انگیز بیانات معاشرے کو توڑتے ہیں، جب کہ مثبت مکالمہ، خیر خواہی اور علم دوستی اُسے جوڑتے ہیں۔

اگر ہر فرد یہ طے کرلے کہ اس کا پیغام کسی کے دل کو دکھانے نہیں بل کہ کسی کے دل کو روشنی دینے کے لیے ہے، تو یہی ڈیجیٹل دنیا انسانیت کے لیے خیر و برکت کا سرچشمہ بن سکتی ہے۔ یہی وہ ابلاغ ہے جو تہذیب کو ارتقا، دلوں کو سکون، اور دنیا کو امن عطا کرتا ہے۔

3- سوشل میڈیا کے چیلنجز اور ان کا حل

سوشل میڈیا نے ابلاغ کی دنیا میں ایک نیا انقلاب برپا کیا ہے۔ اب ہر انسان کے ہاتھ میں وہ قوت ہے جو کبھی ریاستوں، اداروں یا ذرائعِ ابلاغ کے پاس ہوا کرتی تھی مگر ہر قوت کے ساتھ ایک خطرہ بھی جڑا ہوتا ہے۔ یہی صورت یہاں بھی پیدا ہوئی ہے۔ معلومات کی تیز رفتاری، اظہار کی بے مہار آزادی اور رابطے کی وسعت نے جہاں علم و آگہی کے نئے امکانات پیدا کیے ہیں وہیں جھوٹ، نفرت، فریب اور ذہنی انتشار کے دروازے بھی کھول دیے ہیں۔ انسان کا کلام جو کبھی خیر و اصلاح کا ذریعہ تھا اب بسا اوقات فتنہ و فساد کا سبب بننے لگا ہے۔ لہٰذا سوشل میڈیا کے اس عہد میں اصل ضرورت یہ ہے کہ انسان اپنی اس نئی قوت کو اخلاق، ضبط اور مقصد کے تابع رکھے۔ یہی اخلاقی بصیرت ہمیں ان چیلنجز کے مقابلے میں سنبھال سکتی ہے جو جدید ابلاغی ماحول نے ہمارے سامنے لا کھڑے کیے ہیں۔

3.1- فیک نیوز اور غلط معلومات

سوشل میڈیا کا سب سے بڑا بحران جھوٹی خبروں اور غیر مصدقہ معلومات کا پھیلاؤ ہے۔ اب ہر شخص محض ایک کلک سے ایسی خبر دنیا بھر میں پہنچا دیتا ہے جس کی بنیاد کمزور یا سراسر غلط ہوتی ہے۔ اس کے نتیجے میں خوف، نفرت اور بداعتمادی بڑھتی ہے۔ سچ اور جھوٹ کا فرق مٹنے لگتا ہے اور فتنہ علم کی جگہ لے لیتا ہے۔ اس چیلنج کا حل

یہی ہے کہ ہم اپنی گفت گو اور شیئر کیے گئے مواد میں سچائی، تحقیق اور شفافیت کے انہی اصولوں کو ملحوظ رکھیں جو پہلے بیان کیے جا چکے ہیں۔ اگر ہر فرد خود کو ابلاغ کا ذمہ دار اور سچائی کا پاس دار سمجھے تو فیک نیوز کا دروازہ خود بہ خود بند ہو جائے۔

3.2- فراڈ، دھوکا دہی اور استحصال

ڈیجیٹل دنیا نے تجارت اور معلومات کی وسعت ضرور پیدا کی ہے مگر اس کے ساتھ فریب، دھوکا اور استحصال کے نئے طریقے بھی سامنے آئے ہیں۔ جعلی شناختیں، جھوٹے اشتہارات اور مالی فراڈ روزمرہ کے معمول بن چکے ہیں۔ ان سے نہ صرف لوگوں کا سرمایہ بل کہ ان کا باہمی اعتماد بھی متاثر ہو رہا ہے۔ اس چیلنج سے نمٹنے کا راستہ یہی ہے کہ ہم آن لائن دنیا میں بھی دیانت، شفافیت اور امانت داری کے انہی ضوابط کو اپنائیں جو حقیقی زندگی میں اخلاق کا پیمانہ ہیں۔ سچ بولنا، وعدے کی پاس داری کرنا اور نفع کو انصاف کے تابع رکھنا، یہی وہ اصول ہیں جو دھوکے کے اس دَور میں اعتماد کو بحال کر سکتے ہیں۔

3.3- تشدد، نفرت اور عدم رواداری

سوشل میڈیا کا ایک بڑا بحران یہ ہے کہ اختلافِ رائے آہستہ آہستہ دشمنی میں بدل گیا ہے۔ زبانیں سخت اور دل تنگ ہو گئے ہیں۔ معمولی سیاسی یا مذہبی اختلاف غصے، طنز اور تحقیر کا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ یہ رجحان معاشرتی ہم آہنگی کو توڑتا اور انسان کو انتہا پسندی کی طرف دھکیلتا ہے۔ اس مسئلے کا علاج وہی ہے جو پہلے اصولوں میں بیان ہو چکا، شائستگی، نرمیِ بیان، ضبطِ نفس اور احترامِ انسانیت۔ اگر ہم اپنے لہجوں میں تحمل، اپنے مکالمے میں ادب اور اپنے اختلاف میں رواداری پیدا کر لیں تو یہی ذرائع جو نفرت پھیلا رہے ہیں، محبت اور باہمی افہام و تفہیم کے دروازے کھول سکتے ہیں۔

3.4- شہرت کی دوڑ اور ذہنی دباؤ

سوشل میڈیا نے انسان کے باطن میں خود نمائی اور برتری کی جو خواہش پہلے سے چھپی ہوئی تھی، اسے ہوا دے دی۔ اب لوگ اپنی اصل زندگی کے بجائے اپنی نمائشی زندگی میں جیتے ہیں۔ لائکس، فالوورز اور تعریف کی طلب نے ذہنی دباؤ اور احساسِ محرومی کو جنم دیا ہے۔ یہی کیفیت آہستہ آہستہ ''ڈیجیٹل اضطراب'' میں بدل جاتی

ہے۔اس کا تدارک اسی میں ہے کہ انسان خود نمائی کے بجائے مقصدیت، اعتدال اور اخلاصِ نیت کے رویے کو اپنائے جیسا کہ پہلے اصولوں میں ذکر ہو چکا۔ اگر اظہار خدمت کے لیے ہو نہ کہ شہرت کے لیے تو یہی دنیا سکون کا ذریعہ بن سکتی ہے، دکھاوے کا نہیں۔

4-خلاصہ

سوشل میڈیا کے یہ تمام چیلنجز، جھوٹی خبریں، دھوکا دہی، نفرت اور شہرت کی اندھی دوڑ، دراصل انسان کے اندر رونی بحرانوں کا مظہر ہیں۔ ٹیکنالوجی نے انسان کو اظہار کی قوت تو دی ہے مگر کردار کی کمزوری اس قوت کو فتنہ بنا دیتی ہے۔ ان مسائل کا کوئی بیرونی حل نہیں، ان کا علاج انسان کے اخلاقی شعور اور باطنی ضبط میں پوشیدہ ہے۔ یہی شعور اس وقت پیدا ہو سکتا ہے جب ہم وہی اصول ملحوظ رکھیں جو اس یونٹ کے آغاز میں بیان کیے گئے: سچائی، دیانت، احترامِ انسانیت، شائستگی، ضبطِ نفس، امانت داری اور مقصدیت۔

اگر ابلاغ ان قدروں کے تابع ہو جائے تو یہی سوشل میڈیا علم، خیر اور اخلاقی تعمیر کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ اصل مقصد یہ نہیں کہ سوشل میڈیا سے گریز کیا جائے بل کہ یہ ہے کہ اسے اخلاق کے تابع کیا جائے، نہ کہ اخلاق کو اس کے تابع۔

خود آزمائی

۱. سوشل میڈیا نے انسان کے طرزِ ابلاغ اور تعلقات کو کس طرح بدل دیا ہے؟

۲ . موجودہ دور میں آزادیِ اظہار کے ساتھ اخلاقی ذمہ داری کو توازن میں رکھنا کیوں ضروری ہے؟

۳ . فیک نیوز اور غلط معلومات سماجی اعتماد کو کس طرح متاثر کرتی ہیں؟

۴ . فراڈ، دھوکا دہی اور استحصال کے بڑھتے ہوئے رجحانات کی بنیادی وجوہ کیا ہیں؟

۵ . تشدد اور نفرت انگیزی کا فروغ سوشل میڈیا کے ذریعے کن صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے؟

۶ . شہرت کی خواہش اور خود نمائی انسان کی نفسیاتی کیفیت پر کیا اثر ڈالتی ہے؟

۷ . ضبطِ نفس اور مقصدیت کے اصول سوشل میڈیا کے منفی اثرات کو کس طرح کم کر سکتے ہیں؟

۸ . شائستگی اور نرمیِ بیان آن لائن مکالمے کو مہذب بنانے میں کیا کردار ادا کرتی ہے؟

۹ .ابلاغ میں سچائی، تحقیق اور امانت داری کے عملی تقاضے کیا ہیں؟

۱۰ .سوشل میڈیا کے مثبت اور تعمیری استعمال کے لیے کن اخلاقی آداب کو ملحوظ رکھنا چاہیے؟

۱۱ .آپ کے نزدیک ایک ذمہ دار ڈیجیٹل شہری (Digital Citizen) کی بنیادی خصوصیات کیا ہونی چاہییں؟

یونٹ:9

رذائل اخلاق اور ان کی اصلاح

مصنف: ڈاکٹر منشا طیب

نظرِ ثانی: ڈاکٹر نوید اقبال

فہرست عنوانات

یونٹ:9 157

یونٹ کا تعارف 161

یونٹ کے مقاصد 161

1-رذائلِ اخلاق: مفہوم اور اقسام 162

1- نفس سے متعلق رذائل 162

2- سماجی رذائل 163

3- فکری واعتقادی رذائل 163

2-رذائل کے اسباب 164

2.1- ضبطِ نفس کی کمی 164

2.2- غلط تربیت اور فکری بگاڑ 165

2.3-ماحول اور معاشرتی اثرات 166

2.4-مادہ پرستی اور اخلاقی نسبیت 167

2.5- مذہب، علم اور تربیت کے باہمی رشتے کا فقدان 168

3-اصلاحِ اخلاق کے اصول وطریقے 169

3.1- خودشناسی(Self-Knowledge) 170

3.2- خود نظم وضبط(Self-Discipline) 171

3.3-خیر کی محبت(Love of Goodness) 172
3.4- توازن واعتدال(Moderation) 174
3.5-عادتوں کی تربیت(Habit Formation) 175
3.6- محاسبۂ نفس(Self-Reflection) 176
3.7- مثالی شخصیات کی پیروی 178
3.8- نیکی کا معاشرتی فروغ 180
3.9-مقصدِ حیات سے ہم آہنگی(Purpose Alignment) 181
4.-خلاصہ 183
خود آزمائی 185

یونٹ کا تعارف

انسان کی اصل عظمت اس کے ظاہر میں نہیں بل کہ اس کے باطن میں ہے۔ جسم، عقل، علم اور قوت، یہ سب وسائل ہیں مگر اصل بنیاد وہ اخلاقی صفات ہیں جو انسان کے کردار کو بلند اور پاکیزہ بناتی ہیں۔ جب یہ صفات قائم رہتی ہیں تو انسان کی سیرت میں توازن اور سماج میں امن و عدل پیدا ہوتا ہے، لیکن جب یہ کمزور پڑ جائیں تو علم و فن بھی شر کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔

رذائلِ اخلاق دراصل وہ بیماریاں ہیں جو انسان کے باطن میں خاموشی سے جڑ پکڑ لیتی ہیں۔ یہ نفس کی بے اعتدالی اور ارادے کی کمزوری سے جنم لیتی ہیں۔ حرص و حسد، غصہ و کینہ، تکبر و خود غرضی—یہ سب وہ کانٹے ہیں جو انسان کی فطری نیکی کو زخمی کر دیتے ہیں۔ یونانی فلسفہ بدی کو "اعتدال سے انحراف" کہتا ہے، کانٹ کے نزدیک یہ "اخلاقی فرض کی خلاف ورزی" ہے، اور امام غزالیؒ کے نزدیک یہ "نفس کے توازن کا بگاڑ" ہے۔ ان سب تعبیرات کا حاصل یہ ہے کہ بدی کوئی خارجی قوت نہیں، بل کہ انسان کے اندر کی بگاڑ ہے۔

اسلام نے اخلاق کو انسانیت کی بنیاد قرار دیا ہے۔ قرآن مجید انسان کے نفس کی پاکیزگی کو کامیابی کا معیار بتاتا ہے — "قد أفلح من زكاها"۔ اسی لیے یہ یونٹ طلبہ کو اس شعور تک پہنچانے کے لیے ترتیب دیا گیا ہے کہ اخلاقی کمزوریاں کیسے پیدا ہوتی ہیں، ان کے اسباب کیا ہیں اور ان کی اصلاح کے لیے کون سے اصول اور طریقے اپنائے جا سکتے ہیں۔ اس مطالعے میں اسلامی فکر کے ساتھ ساتھ دیگر فلسفیانہ اور نفسیاتی زاویے بھی زیرِ بحث آئیں گے تاکہ طلبہ اس نتیجے تک پہنچ سکیں کہ اخلاق کی تعمیر دراصل انسان کی حقیقی تعمیر ہے۔

یونٹ کے مقاصد

امید ہے کہ اس یونٹ کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1. رذائلِ اخلاق کے مفہوم اور ان کی بنیادی اقسام کو سمجھ سکیں۔
2. اخلاقی بگاڑ کے نفسیاتی، فلسفیانہ اور سماجی اسباب کو واضح کر سکیں۔
3. ضبطِ نفس، خود شناسی اور خیر کی محبت جیسے آفاقی اصولوں کو پہچان سکیں۔
4. اصلاحِ اخلاق کے نظری اور عملی طریقوں کی وضاحت کر سکیں۔
5. جدید معاشرتی چیلنجز جیسے مادہ پرستی، خود غرضی اور ڈیجیٹل بے اعتدالی کا اخلاقی تجزیہ کر سکیں۔
6. فرد، خاندان اور معاشرے میں کردار سازی کے متوازن اصول پیش کر سکیں۔

1-رذائلِ اخلاق: مفہوم اور اقسام

اخلاق انسان کی شخصیت کا سب سے نازک اور اہم پہلو ہے۔ یہ وہ پوشیدہ قوت ہے جو انسان کے اعمال کو معنی اور اس کے کردار کو سمت عطا کرتی ہے۔ اگر اخلاق درست ہوں تو انسان کی پوری زندگی ایک منظم اور متوازن صورت اختیار کر لیتی ہے، لیکن جب اخلاق میں بگاڑ پیدا ہو جائے تو وہی انسان جو خیر و بھلائی کا ذریعہ بن سکتا تھا فساد اور تباہی کا سبب بن جاتا ہے۔ یہی بگاڑ **رذائلِ اخلاق** کہلاتا ہے۔

رذیلہ دراصل اس کیفیت کا نام ہے جس میں انسان اپنی فطرت کے توازن سے ہٹ جاتا ہے۔ خالقِ کائنات نے انسان کے اندر مختلف قوتیں رکھی ہیں: خواہش، غصہ، عقل اور وجدان۔ ان سب کا صحیح تناسب برقرار رہے تو انسان صالح بن جاتا ہے اور اگر کسی ایک قوت کا غلبہ ہو جائے تو توازن ٹوٹ جاتا ہے۔ یہی ٹوٹا ہوا توازن رذالت میں بدلتا ہے۔

امام غزالیؒ کے نزدیک نفس کا فساد وہ حالت ہے جب خواہشات عقل پر حاوی ہو جائیں اور انسان خیر کی پہچان کے باوجود شر کی راہ اختیار کرے۔ ارسطو کے نزدیک بدی اعتدال سے انحراف ہے، یعنی کسی صفت میں حدِّ وسط سے تجاوز کرنا۔ کانٹ کے نزدیک بدی وہ ہے جب انسان اپنا اخلاقی فرض صرف اپنی خواہش کے تابع کر لے نہ کہ اصولِ عقل کے تابع۔

ان سب اقوال کا حاصل یہ ہے کہ رذائلِ اخلاق کا سرچشمہ انسان کے اندر ہے، باہر نہیں۔ شیطان انسان کو صرف وسوسہ دیتا ہے مگر فیصلہ انسان کا اپنا ہوتا ہے۔ انسان کی اصل آزمایش یہی ہے کہ وہ خیر و شر کے درمیان توازن قائم رکھے۔ اگر یہ توازن بگڑ جائے تو خواہ وہ عالم ہو یا جاہل، صاحبِ اقتدار ہو یا عام انسان، اس کی اخلاقی حیثیت مجروح ہو جاتی ہے۔

رذائلِ اخلاق کی بنیاد عام طور پر تین بڑی جہتوں میں دیکھی جاسکتی ہے:

1- نفس سے متعلق رذائل

یہ وہ خرابیاں ہیں جو انسان کے اندرونی میلانات سے جنم لیتی ہیں جیسے حرص، حسد، غصہ، بخل، لالچ،

خوف اور خود پسندی۔ حرص انسان کو اطمینان سے محروم کر دیتی ہے، حسد دوسروں کی نعمت کو زہر بنا دیتا ہے اور غصہ انسان کی عقل کو اندھا کر دیتا ہے۔ بخل دل کی تنگی پیدا کرتا ہے اور خود پسندی انسان کو حق سے رو گرداں کر دیتی ہے۔ ان تمام رذائل میں ایک قدرِ مشترک ہے: خود پرستی۔ جب انسان اپنی ذات کو مرکز بنا لیتا ہے تو دوسروں کے حقوق، انصاف اور خیر سب ماند پڑ جاتے ہیں۔

2- سماجی رذائل

یہ وہ رذائل ہیں جو انسان کے باہمی تعلقات میں ظاہر ہوتے ہیں جیسے ظلم، تکبر، منافقت، غیبت اور دھوکا۔ یہ برائیاں صرف فرد کے اخلاق کو نہیں بل کہ پورے معاشرے کے توازن کو بگاڑ دیتی ہیں۔ جو شخص اپنے مرتبے یا مال کی بنیاد پر دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے وہ دراصل انسانیت کی توہین کرتا ہے۔ اسلام نے تکبر کو شیطانی صفت قرار دیا ہے کیوں کہ یہی وہ زہر ہے جس نے ابلیس کو سجدۂ آدم سے روکا۔

3- فکری و اعتقادی رذائل

یہ وہ باطنی بیماریاں ہیں جو عقل و فکر کو مسخ کر دیتی ہیں۔ ان میں جہالت، تعصب، تنگ نظری، ضد اور انکارِ حق شامل ہیں۔ فکری رذائل انسان کو اندھی تقلید پر مائل کرتے ہیں اور وہ سچائی کو دیکھ کر بھی رد کر دیتا ہے۔ یہی وہ بگاڑ ہے جو علمی طبقے میں بھی پیدا ہو سکتا ہے، علم باقی رہتا ہے مگر بصیرت ختم ہو جاتی ہے۔

ان تمام رذائل کی جڑ نفس کا غلبہ ہے۔ جب انسان اپنے اندر کے حیوانی میلان کو قابو میں نہیں رکھتا تو وہ عقل و ایمان کی رہ نمائی سے محروم ہو جاتا ہے۔ یہی وہ لمحہ ہے جب انسان اپنی انسانیت کی بلندی سے گر کر خواہشات کا غلام بن جاتا ہے۔

اسلامی تعلیمات میں رذائل کی اصلاح کو عبادت سے الگ نہیں سمجھا گیا۔ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

»إِنَّ مِنْ خِيَارِكُمْ أَحْسَنَكُمْ أَخْلَاقًا« (صحیح بخاری، حدیث 3559)

یعنی تم میں سب سے بہتر وہ ہے جس کا اخلاق بہتر ہے۔

گویا عبادت کا حقیقی ثمر اخلاقی تزکیہ ہے۔ اگر انسان کے اخلاق درست نہیں تو اس کی عبادت محض رسم بن جاتی ہے۔ رذائلِ اخلاق کو سمجھنا، ان کی اقسام کو پہچاننا اور ان کے اسباب پر غور کرنا دراصل اصلاحِ نفس کا پہلا مرحلہ ہے۔ جب انسان اپنے اندر کے دشمن کو پہچان لیتا ہے تو اس کی اصلاح ممکن ہو جاتی ہے۔ یہی شعور تعمیرِ شخصیت کا نقطۂ آغاز ہے۔

2-رذائل کے اسباب

اخلاقی زوال اچانک پیدا نہیں ہوتا، اس کی جڑیں انسان کے اندر اور معاشرے کے ماحول دونوں میں پیوست ہوتی ہیں۔ نفس کی کمزوری، ارادے کی بے سمتی، تربیت کی کمی اور ماحول کی گم راہی یہ سب مل کر اس کردار کو بگاڑ دیتے ہیں جو فطرتاً خیر کا طالب ہوتا ہے۔ انسان جب اپنے رب کے شعور سے غافل ہو جاتا ہے تو اس کا ضمیر مدھم پڑ جاتا ہے اور پھر خیر و شر کی تمیز محض ایک فلسفیانہ بحث بن کر رہ جاتی ہے۔ رذائل کا ظہور دراصل اسی غفلت کا نتیجہ ہے۔ جس دل میں اللہ کا خوف اور جواب دہی کا احساس زندہ ہو وہ ظلم، حرص، حسد یا خود غرضی میں زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتا۔ چناں چہ اخلاقی کم زوری کے اسباب صرف انفرادی نہیں بل کہ فکری، نفسیاتی اور سماجی بھی ہیں جنھیں سمجھنا اصلاحِ نفس کے لیے ناگزیر ہے۔

2.1- ضبطِ نفس کی کمی

انسان کی سب سے بڑی قوت اس کا ارادہ ہے اور سب سے بڑی کم زوری اس ارادے پر قابو نہ رکھ پانا۔ ضبطِ نفس وہ داخلی نظام ہے جو انسان کو خواہشات کے طوفان میں بہنے سے روکتا ہے۔ اگر یہ قوت کم زور پڑ جائے تو انسان کا اخلاقی وجود بکھر جاتا ہے۔ قرآنِ مجید انسان کو ''نفسِ امّارہ'' سے خبردار کرتا ہے جو برائی کی طرف مائل کرتا ہے اور مسلسل خیر سے غافل رکھتا ہے۔ یہی وہ کیفیت ہے جس میں انسان لمحاتی لذت کو ابدی نقصان پر ترجیح دینے لگتا ہے۔

ضبطِ نفس کی کمی کی جڑ خواہشات کی بندگی میں ہے۔ جب انسان اپنی خواہش کو معیارِ حق بنالیتا ہے تو عقل اور ایمان دونوں بے بس ہو جاتے ہیں۔ وہ جانتے بوجھتے بھی غلطی کرتا ہے اور پھر اپنے فعل کے لیے تاویلیں تراشتا

ہے۔ یہی رویّہ آہستہ آہستہ اسے گناہ پر جری اور بدی پر مطمئن کر دیتا ہے۔ ارسطو کے نزدیک اخلاقی تربیت کا پہلا مرحلہ یہی ہے کہ انسان اپنی خواہشوں کو عقل کے تابع کرے۔ امام غزالیؒ نے ضبطِ نفس کو تزکیۂ نفس کی بنیاد کہا ہے کیوں کہ جب تک ارادہ مضبوط نہ ہو علم اور وعظ دونوں بے اثر رہتے ہیں۔

ضبطِ نفس کی کمی محض انفرادی مسئلہ نہیں، یہ پورے معاشرے میں پھیلنے والا اخلاقی زہر ہے۔ جب لوگ اپنی خواہشات کے غلام بن جائیں تو اجتماعی انصاف اور دیانت کے اصول ٹوٹ جاتے ہیں۔ تجارت میں دھوکا، حکومت میں بددیانتی، تعلیم میں ریا اور عبادت میں دکھاوا یہ سب اسی ایک کم زوری کے شاخسانے ہیں۔ چناں چہ اخلاقی اصلاح کا پہلا قدم یہ ہے کہ انسان اپنے اندر ضبط پیدا کرے، اپنی خواہش پر اختیار حاصل کرے اور اپنے ارادے کو خیر کے تابع بنادے۔

2.2- غلط تربیت اور فکری بگاڑ

انسان کی فطرت اگرچہ خیر کی طرف مائل ہے مگر یہ میلان خود بخود عمل میں نہیں بدلتا۔ اس کے لیے صحیح رہ نمائی اور متوازن تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب تربیت کی بنیاد محض معلومات، نمبروں یا دنیاوی کام یابی پر رکھی جائے اور اخلاقی شعور کو نظر انداز کر دیا جائے تو ذہن ترقی کرتا ہے مگر ضمیر کم زور پڑ جاتا ہے۔ یہی وہ خلا ہے جس سے اخلاقی بگاڑ جنم لیتا ہے۔

غلط تربیت کا مطلب صرف دینی تعلیم سے محرومی نہیں بل کہ وہ ذہنی تشکیل بھی ہے جس میں انسان کو مادّی کام یابی کا دیوانہ اور اخلاقی قدروں سے غافل بنا دیا جاتا ہے۔ موجودہ تعلیمی اور معاشرتی نظام نے انسان کو مقابلے کا عادی تو بنا دیا ہے مگر کردار کی تربیت سے خالی چھوڑ دیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ علم بڑھتا ہے مگر حکمت گھٹتی ہے اور شعور بیدار ہوتا ہے مگر ضمیر سو جاتا ہے۔

تربیت کا فکری پہلو بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا عملی۔ اگر فکر میں غلطی پیدا ہو جائے تو عمل کی سمت خود بخود بگڑ جاتی ہے۔ مغربی تہذیب نے فرد کو کائنات کا محور بنا دیا ہے اور اس فکر نے انسان کو اپنے خالق سے کاٹ کر خود اس کی خواہشات کے طواف میں لگا دیا۔ جب نظریہ ہی خود غرضی پر قائم ہو تو کردار میں ایثار کیسے باقی رہ سکتا ہے؟

اسلامی نقطۂ نظر سے صحیح تربیت وہ ہے جو انسان کے علم، عمل اور نیت، تینوں کو ایک مقصد سے وابستہ

کرے: اللہ کی رضا۔ یہی وہ بنیاد ہے جو انسان کو نہ صرف اخلاقی انحراف سے بچاتی ہے بل کہ اسے خیر کا ذریعہ بناتی ہے۔ چناں چہ جہاں تربیت کا مقصد محض پیشہ یا ظاہری کام یابی ہو وہاں رذائلِ اخلاق کا پھیلنا ناگزیر ہے۔

2.3-ماحول اور معاشرتی اثرات

انسان اگرچہ صاحبِ عقل اور ارادے کی مخلوق ہے مگر وہ اپنے ماحول سے بے اثر نہیں رہ سکتا۔ معاشرتی فضا ہی وہ سانچہ ہے جس میں افراد کے کردار ڈھلتے ہیں۔ اگر فضا میں صدق، عدل اور خیر کا غلبہ ہو تو انسان خود بخود نیکی کی طرف مائل ہوتا ہے لیکن اگر ماحول حرص، جھوٹ اور خود غرضی سے آلودہ ہو تو باطن کی روشنی مدھم پڑ جاتی ہے۔ یہی وہ زہر ہے جو آہستہ آہستہ اجتماعی ضمیر کو مفلوج کر دیتا ہے۔

ماحول کا سب سے طاقت ور پہلو معاشرتی اقدار ہیں۔ جب معاشرے میں کام یابی کا معیار کردار نہیں بل کہ دولت اور نمود و نمائش بن جائے تو نیکی کم زوری اور بدی چالاکی سمجھی جانے لگتی ہے۔ عصر حاضر میں انسان کو بچپن سے یہ سبق دیا جاتا ہے کہ آگے بڑھنے کے لیے کسی بھی قیمت پر جیتنا ضروری ہے؛ نتیجہ یہ ہے کہ جھوٹ، دھوکا اور مفاد پرستی زندگی کا معمول بن گئے ہیں۔

میڈیا اور اشتہارات نے اس بگاڑ کو اور گہرا کر دیا ہے۔ روزانہ کے پیغامات انسان کے لاشعور میں یہ تاثر بٹھاتے ہیں کہ کام یابی صرف ظاہری چمک دمک کا نام ہے۔ سوشل میڈیا نے شہرت کی بھوک کو ایک نئی شکل دے دی ہے جہاں لوگ کردار نہیں بل کہ تصویری تاثر کے قیدی بن گئے ہیں۔ اس مصنوعی مسرت نے انسان کے اندر سے وہ سادہ خوشی چھین لی ہے جو صدق اور ایثار سے پیدا ہوتی تھی۔

اسلامی نقطۂ نظر سے ماحول محض معاشرتی مظاہر کا نام نہیں بل کہ ایک اخلاقی فضا ہے۔ نبیِ کریم ﷺ نے فرمایا:

اَلرَّجُلُ عَلَى دِينِ خَلِيلِهِ فَلْيَنْظُرْ أَحَدُكُمْ مَنْ يُخَالِلُ (سنن ترمذی، حدیث: 2378)

"آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے، پس تم میں سے ہر شخص دیکھے کہ وہ کس کو دوست بناتا ہے۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے باطن پر صحبت اور ماحول کا اثر بہ راہِ راست پڑتا ہے۔ اگر انسان ایسے حلقے میں رہے جہاں ذکر الٰہی، عدل اور خیر غالب ہوں تو اس کے اخلاق سنورتے ہیں لیکن اگر وہ بدی کے ماحول میں ہو تو دل سخت اور ضمیر کم زور ہو جاتا ہے۔

چناں چہ رذائلِ اخلاق کی روک تھام کے لیے انفرادی اصلاح کے ساتھ ساتھ اجتماعی فضا کی تطہیر بھی ضروری ہے۔ معاشرہ جب نیکی کی قدر اور بدی کی مذمت کرنے لگے تو یہی فضا انسان کو خیر کے راستے پر استوار رکھتی ہے۔

2.4-مادہ پرستی اور اخلاقی نسبیت

اخلاقی زوال کے جدید ترین اسباب میں سب سے گہرا اور خطرناک سبب مادّہ پرستی ہے۔ انسان جب اپنی زندگی کا مقصد محض مادی آسایش، طاقت یا شہرت کے حصول تک محدود کر لیتا ہے تو اس کا اخلاقی شعور پژمردہ ہو جاتا ہے۔ دولت اور لذت اگر زندگی کا نصب العین بن جائیں تو خیر و شر کی تمیز دھندلا جاتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسان اپنی انسانیت کھو بیٹھتا ہے۔

مادّہ پرستی دراصل روح کی بھوک کو جسم کی خواہش سے بھرنے کی کوشش ہے۔ انسان سمجھتا ہے کہ اگر اس کے پاس سب کچھ ہو تو سکون بھی حاصل ہو جائے گا مگر جوں جوں وہ چیزیں جمع کرتا ہے دل کی ویرانی بڑھتی جاتی ہے۔ یہی وہ باطنی اضطراب ہے جس نے جدید انسان کو بظاہر ترقی یافتہ مگر باطن میں بے چین کر دیا ہے۔ قرآن نے ایسے انسان کو "خاسر الدنیا والآخرۃ" کہا ہے جو نہ دنیا میں سکون پاتا ہے نہ آخرت میں نجات۔

اس مادّہ پرست رویّے کے ساتھ ساتھ ایک اور فکری مرض بھی اخلاقی زوال کو بڑھاتا ہے اور وہ ہے **اخلاقی نسبیت** (Moral Relativism)۔ جدید فکر نے یہ نظریہ عام کر دیا ہے کہ اچھائی اور برائی کے کوئی مطلق اصول نہیں، ہر فرد اپنے لیے خود معیار طے کرے۔ اس سوچ نے انسان کو ضمیر کے بجائے مفاد کا پیرو بنا دیا ہے۔ اب سچ وہی ہے جو نفع دے اور جھوٹ وہی جو فائدہ نہ دے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انسان کے پاس کوئی مستقل اخلاقی پیمانہ باقی نہ رہا۔

اسلامی نقطۂ نظر اس کے برعکس ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ خیر اور شر کے اصول ازلی اور ابدی ہیں اور ان کا

سرچشمہ وحیِ الٰہی ہے۔ انسان اپنی خواہش کے مطابق نیکی اور بدی کی تعریف نہیں بدل سکتا۔ جب وحی سے رشتہ کم زور ہو جائے تو اخلاقی بنیادیں ریت کی دیوار بن جاتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ آج کے مادّہ پرست معاشرے میں انصاف، دیانت اور عفت جیسے تصورات محض کتابی الفاظ بن کر رہ گئے ہیں۔

مادّہ پرستی اور اخلاقی نسبیت نے انسان کو اپنے خالق سے نہیں صرف الگ کیا بل کہ اپنے آپ سے بھی بے گانہ کر دیا۔ اس نے ضمیر کو کم زور، ارادے کو آوارہ اور احساس کو بے حس بنا دیا۔ چناں چہ جب تک انسان اپنی اقدار کا مرکز اللہ کی رضا اور آخرت کی جواب دہی کو نہیں بناتا، تب تک اس کی اخلاقی زندگی کسی مضبوط بنیاد پر قائم نہیں ہو سکتی۔

2.5- مذہب، علم اور تربیت کے باہمی رشتے کا فقدان

اخلاقی زوال کا سب سے بڑا مظہر اس وقت سامنے آتا ہے جب مذہب، علم اور تربیت ایک دوسرے سے کٹ جائیں۔ جب علم کا دائرہ محض معلومات تک محدود ہو جائے، مذہب عبادت گاہوں میں سمٹ جائے اور تربیت صرف ظاہری آداب تک رہ جائے تو کردار کی جڑیں سوکھنے لگتی ہیں۔ یہی وہ خلا ہے جس نے انسان کی فکری و اخلاقی زندگی کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے: ایک حصہ جو اللہ کے نام پر ہے اور دوسرا جو دنیا کے مفاد کے لیے۔

مذہب کا اصل مقصد انسان کو اللہ کی بندگی کے ساتھ ساتھ انسانیت کی خدمت کا شعور دینا ہے۔ اگر دین صرف ظاہری رسموں کا مجموعہ بن جائے اور زندگی کے عملی شعبوں سے اس کا رشتہ ٹوٹ جائے تو ایمان اخلاق پیدا نہیں کرتا۔ علم اس وقت روشنی بن سکتا ہے جب وہ ایمان کے ساتھ جڑا ہو اور تربیت اس وقت ثمر آور ہوتی ہے جب وہ علم اور عقیدہ دونوں سے غذا لے۔ اگر یہ تینوں جدا ہو جائیں تو علم نفع کے لیے، دین رسم کے لیے اور تربیت محض ظاہر کے لیے رہ جاتی ہے۔

اسلامی تہذیب میں علم اور اخلاق کبھی جدا نہیں سمجھے گئے۔ قرآنِ مجید میں ارشاد ہے:

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ (سورۃ المجادلہ، 11)

"اللہ تم میں سے ان لوگوں کے درجات بلند کرتا ہے جو ایمان لائے اور جنھیں علم دیا گیا۔"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

»تَرَكْتُ فِيكُمْ أَمْرَيْنِ، لَنْ تَضِلُّوا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا: كِتَابَ اللهِ وَسُنَّتِي«(موطأ امام مالک، حدیث:1628)

"میں تمھارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جارہا ہوں، جب تک ان کو مضبوطی سے تھامے رکھو گے کبھی گم راہ نہ ہو گے: اللہ کی کتاب اور میری سنت۔"

یہی وہ رشتہ ہے جو علم کو اخلاق اور تربیت کو کردار میں بدلتا ہے۔ موجودہ دور میں جب تعلیم کا نظام مذہب سے الگ اور تربیت سے بے ربط ہو چکا ہے تو ذہن تیز ہو گئے ہیں مگر دل سخت ہو گئے ہیں۔ انسان کو سائنسی ترقی نے سہولتیں تو دی ہیں مگر سکون چھین لیا ہے۔ اگر علم اور مذہب کے درمیان یہ فاصلہ باقی رہا تو اخلاقی اصلاح محض وعظ کی حد تک محدود رہے گی۔

اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلیم کے نظام میں دوبارہ وہ روح پھونکی جائے جو علم کو عبادت اور تربیت کو تزکیۂ نفس بنادے۔ جب تک مذہب، علم اور تربیت ایک وحدت کی صورت میں جمع نہیں ہوتے، تب تک انسان کا اخلاقی ارتقا ممکن نہیں۔ یہی تین ستون ہیں جن پر تعمیرِ سیرت اور تزکیۂ کردار کی پوری عمارت قائم ہوتی ہے۔

3-اصلاحِ اخلاق کے اصول وطریقے

انسان کی فطرت میں خیر وشر، دونوں کے بیج رکھے گئے ہیں، مگر ان میں سے کون سا بیج پھوٹے گا، یہ انسان کے اختیار پر منحصر ہے۔ اخلاقی اصلاح دراصل اسی اختیار کی درست سمت میں رہ نمائی کا نام ہے۔ یہ رہ نمائی دراصل فطرتِ انسانی کے اس نور کو بیدار کرتی ہے جو اللہ نے ہر دل میں ودیعت فرمایا ہے۔ انسان اپنی کم زوریوں سے بے خبر نہیں ہوتا، مگر اکثر وہ ان کے علاج سے غافل رہتا ہے۔ یہی غفلت رذائل کو طاقت دیتی ہے اور فضائل کو کم زور کر دیتی ہے۔ اصلاحِ اخلاق کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے باطن میں ضبط، توازن اور خیر کی محبت پیدا کرے تاکہ وہ اپنے نفس کی بندگی سے نکل کر اللہ کی بندگی میں آئے۔

اصلاحِ اخلاق محض وعظ یا تلقین سے ممکن نہیں، یہ ایک مسلسل تربیتی عمل ہے جس میں علم، ارادہ، عادت اور عمل، سب کو ہم آہنگ کیا جاتا ہے۔ اخلاقی اصول اگر ذہن تک محدود رہیں تو ان کا اثر عارضی ہوتا ہے، مگر جب وہ دل میں یقین بن جائیں تو کردار بدل جاتا ہے۔ یہی تبدیلی انسانی تعمیر کا نقطۂ آغاز ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"أَلَا وَإِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ" (صحیح بخاری، 52)

یعنی "جان لو کہ بدن میں ایک ٹکڑا ہے، اگر وہ درست ہو جائے تو پورا بدن درست ہو جاتا ہے، اور اگر وہ بگڑ جائے تو پورا بدن بگڑ جاتا ہے، وہ دل ہے۔"

اسلامی فکر میں اخلاق کی اصلاح کو تزکیۂ نفس، تربیتِ روح اور تعمیرِ سیرت کے ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔ قرآن مجید نے اسے کامیابی کی شرط قرار دیا ہے — ﴿قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا﴾ — یعنی فلاح اسی کے لیے ہے جس نے اپنے نفس کو پاک کیا۔ اس عمل کے بغیر علم، عبادت اور عقیدہ سب ادھورے رہتے ہیں۔ اس لیے اس باب میں ہم ان آفاقی اصولوں اور عملی طریقوں کا جائزہ لیں گے جو انسان کو اپنی اخلاقی زندگی میں توازن، نظم اور خیر کی محبت پیدا کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

3.1- خودشناسی (Self-Knowledge)

اصلاحِ اخلاق کا پہلا اور سب سے بنیادی زینہ خود شناسی ہے۔ جب تک انسان اپنے آپ کو نہیں پہچانتا، وہ اپنے رب کو بھی نہیں پہچان سکتا، اور جب انسان اپنی حقیقت سے غافل ہو جائے تو ساری علمیت اور عبادت رسمی بن جاتی ہے۔ خود شناسی کا مطلب محض اپنے نام، نسب یا ظاہری صلاحیتوں کا علم نہیں، بل کہ اپنے باطن کی قوتوں، کم زوریوں، میلانات اور مقاصد کو سمجھنا ہے۔ یہی وہ شعور ہے جو انسان کو اپنی اخلاقی سمت متعین کرنے میں مدد دیتا ہے۔

سقراط نے کہا تھا: "اپنے آپ کو پہچانو" یہ جملہ انسانی اخلاقیات کی تاریخ میں ایک سنگِ میل ہے۔ امام غزالیؒ نے اس خیال کو اسلامی تناظر میں یوں بیان کیا کہ "جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان

لیا۔ ''یعنی انسان جب اپنے اندر جھانکتا ہے تو اسے اپنی ناتوانی، محتاجی اور عبدی حیثیت کا احساس ہوتا ہے، اور یہی احساس اس کے اخلاقی رویّے کو بدل دیتا ہے۔ یوں اسلام نے فلسفۂ خود شناسی کو محض فکری مشق نہیں بل کہ روحانی تزکیے کا ذریعہ قرار دیا۔

خود شناسی دراصل اپنے اندر کے تضاد کو سمجھنے کا عمل ہے۔ انسان بہ یک وقت خیر کا طالب بھی ہے اور شر کی کشش میں مبتلا بھی۔ وہ عقل رکھتا ہے مگر خواہش بھی۔ وہ ایمان سے روشنی لیتا ہے مگر دنیا سے اندھیرا بھی۔ جب تک یہ شعور نہ ہو کہ میرے اندر کن قوتوں کی کش مکش جاری ہے، تب تک اصلاح محض ایک نعرہ رہتی ہے۔ قرآن مجید فرماتا ہے: ﴿بَلِ الْإِنسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ﴾ (القیامۃ: 14) ''بل کہ انسان خود اپنی ذات پر خوب آگاہ ہے۔''

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید انسان کو بار بار ''تدبر''، ''تفکر'' اور ''محاسبہ'' کی دعوت دیتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''الْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ '' (سنن ترمذی، 2459)

یعنی ''عاقل وہ ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ کرے اور موت کے بعد کے لیے عمل کرے۔''

یوں خود شناسی انسان کو اندرونی تزکیے کی راہ دکھاتی ہے۔ جب انسان جان لیتا ہے کہ اس کے اندر سب سے بڑا دشمن اس کا اپنا نفس ہے، تو وہ دوسروں کی خامیوں کے بجائے اپنی اصلاح میں مصروف ہو جاتا ہے۔ یہی نقطۂ آغاز ہے تعمیرِ کردار کا، اور یہی وہ علم ہے جس سے ہر خیر پھوٹتی ہے۔

3.2- خود نظم وضبط (Self-Discipline)

انسان کی زندگی میں آزادی ایک نعمت ہے مگر یہی نعمت اگر ضبط کے بغیر ہو تو زحمت بن جاتی ہے۔ خود نظم وضبط دراصل اس شعور کا نام ہے جس میں انسان اپنی خواہش کو عقل کے تابع اور اپنے ارادے کو اصول کے تابع رکھتا ہے۔ یہ اخلاقی تربیت کی وہ بنیاد ہے جس پر باقی تمام فضائل قائم ہوتے ہیں۔ اگر انسان کے اندر ضبط نہ ہو تو اس کا علم، دولت، اور اختیار سب بیکار ہو جاتے ہیں۔

اسلامی تصورِ اخلاق میں ضبطِ نفس کو ایمان کے لازمی تقاضوں میں شمار کیا گیا ہے۔ روزہ اسی تربیت کا عملی مظہر

ہے — کہ انسان اپنی جائز خواہش پر بھی قابو پاتا ہے تاکہ ارادہ مضبوط اور روح پاکیزہ ہو۔ نماز بھی اسی نظم وضبط کا تسلسل ہے، جو دن میں پانچ بار انسان کو یاد دلاتی ہے کہ وہ خواہش کا نہیں، اصول کا تابع ہے۔

فلسفیانہ اعتبار سے یہ وہی اصول ہے جسے Stoicism نے ''عقل کی بادشاہی'' کہا ہے اور جدید نفسیات اسے ''Self-Regulation'' کے نام سے جانتی ہے۔ مگر اسلام نے اس تصور کو محض ذہنی یا نفسیاتی عمل نہیں رکھا بل کہ اسے ایمان اور تقویٰ کے ساتھ جوڑ دیا۔ چوں کہ تقویٰ کا مطلب ہی ہے ''خود کو قابو میں رکھنا'' اس لیے جو شخص جتنا زیادہ متقی ہے، وہ اتنا ہی منظم اور خود پر قابو رکھنے والا ہے۔

خود نظم وضبط کا آغاز چھوٹی باتوں سے ہوتا ہے: اپنے وقت کی پابندی، وعدے کی پاس داری، زبان پر قابو، اور غصے کے وقت خاموشی اختیار کرنا۔ یہ بظاہر معمولی باتیں ہیں مگر کردار کی تعمیر میں یہی بنیادیں سب سے مضبوط دیوار بنتی ہیں۔ قرآن کہتا ہے" :اِنّ اللہ یحبّ المحسنین "یعنی اللہ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اپنے اعمال میں حسن اور توازن پیدا کرتے ہیں۔ یہ حسن وتوازن دراصل ضبط ہی کا ثمر ہے۔

جدید معاشرے میں خود نظم وضبط کی سب سے بڑی آزمائش ڈیجیٹل دنیا ہے۔ انسان لمحہ بھر میں اپنی توجہ بکھرا دیتا ہے، دل بھی منتشر اور وقت بھی ضائع۔ اس زمانے میں ضبط کا مطلب صرف خواہشات پر قابو نہیں بل کہ اپنی توجہ، وقت اور توانائی کو مقصد کے تابع رکھنا بھی ہے۔

پس جس دل میں ضبط پیدا ہو گیا، اس نے اپنی روح کو آزاد کر لیا۔ ایسا انسان دنیا کے شور میں بھی سکون پاتا ہے کیوں کہ وہ خود اپنے نفس کا حاکم بن گیا۔ یہی وہ قوت ہے جو انسان کو رذائل کے حملوں سے بچاتی اور فضائل کے راستے پر قائم رکھتی ہے۔

3.3-خیر کی محبت(Love of Goodness)

اخلاقی تربیت کا اصل مقصود صرف برائی سے بچنا نہیں بل کہ نیکی سے محبت پیدا کرنا ہے۔ انسان جب خیر کو صرف فرض یا مجبوری کے طور پر نہیں بل کہ دل کی طلب اور روح کی غذا سمجھ کر اختیار کرتا ہے تو اس کا کردار اندر سے روشن ہو جاتا ہے۔ خیر کی محبت وہ قوت ہے جو انسان کو رذائل کے اندھیروں سے نکال کر فضائل کی روشنی میں لے جاتی ہے۔

نیکی اگر عادت بن جائے مگر محبت کے بغیر ہو تو وہ محض رسم بن جاتی ہے۔ محبت ہی وہ جذبہ ہے جو نیکی کو دوام اور تاثیر دیتا ہے۔ جب انسان خیر کو اپنی خوشی کا ذریعہ بنالیتا ہے تو اس کے لیے قربانی مشکل نہیں رہتی۔ یہی وہ کیفیت ہے جسے قرآن نے ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ﴾ کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ یعنی اہلِ ایمان کی محبت سب سے بڑھ کر اللہ کے لیے ہے۔ جس دل میں اللہ کی محبت جاگزیں ہو جائے وہاں نیکی بوجھ نہیں رہتی بل کہ سکونِ قلب بن جاتی ہے۔

فلسفیانہ اعتبار سے بھی خیر کی محبت اخلاقی اصولوں کی بنیاد ہے۔ ارسطو نے کہا تھا کہ فضیلت وہ عادت ہے جو خیر کی طلب سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ وہ درجہ ہے جہاں انسان نیکی اس لیے نہیں کرتا کہ اس سے نفع ملے بل کہ اس لیے کہ نیکی اپنی ذات میں محبوب ہے۔

جب انسان خیر سے محبت کرتا ہے تو وہ دوسروں کے لیے بھلائی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اس کے دل میں ایثار، رحم اور عدل جیسے جذبات خود بہ خود جنم لیتے ہیں۔ وہ دوسروں کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھتا ہے اور کسی کے حق پر قبضہ کرنا اپنی کام یابی نہیں جانتا۔ یہی کیفیت انبیا و صلحا کے کردار میں نمایاں ہے۔ ان کے نزدیک نیکی نہ کوئی فلسفہ تھی نہ محض اصول بل کہ محبت کا فطری اظہار۔

خیر کی محبت دراصل ایمان کی علامت ہے۔ جو دل نیکی سے لطف اندوز نہیں ہوتا اس کا ایمان کم زور ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى يُحِبَّ لِأَخِيهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ'' (صحیح بخاری، 13)

''تم میں سے کوئی اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔''

یہ حدیث خیر کی محبت کا عملی خاکا خاکہ ہے۔ انسان جب دوسروں کے لیے وہی چاہنے لگے جو اپنے لیے چاہتا ہے تو اس کا دل نورِ ایمان سے منور ہو جاتا ہے۔

خیر کی محبت ہی وہ قوت ہے جو ضبطِ نفس کو سہارا دیتی، نیت کو خالص رکھتی اور عمل کو دوام بخشتی ہے۔ یہی محبت انسان کو خود غرضی سے نکال کر انسانیت کے اعلیٰ مقام تک پہنچاتی ہے۔

3.4- توازن واعتدال(Moderation)

انسانی زندگی کے تمام فضائل کی بنیاد توازن اور اعتدال پر ہے۔ یہی وہ اصول ہے جو فرد کے باطن سے لے کر معاشرت کے نظام تک ہر سطح پر حسن اور استقامت پیدا کرتا ہے۔ اعتدال کا مطلب یہ نہیں کہ انسان اپنے جذبات کو دبادے بل کہ یہ ہے کہ وہ ان جذبات کو ان کی صحیح حد میں رکھے۔ غصہ اگر حد سے بڑھے تو ظلم بن جاتا ہے اور بالکل ختم ہو جائے تو بزدلی۔ سخاوت اگر اعتدال سے نکل جائے تو اسراف ہے اور اگر کم ہو جائے تو بخل۔ ہر اخلاقی صفت کا حسن اسی میں ہے کہ وہ اپنی فطری حد پر قائم رہے۔

قرآن مجید نے اسی اصول کو "امّتِ وسط" کے عنوان سے بیان کیا ہے: ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا﴾ یعنی ہم نے تمھیں ایک معتدل امت بنایا۔ اسلام نے نہ رہبانیت کو پسند کیا اور نہ عیّاشی کو، نہ دنیا سے مکمل کنارہ کشی کی تعلیم دی اور نہ دنیا میں غرق ہو جانے کی۔ اس نے انسان کو یہ سکھایا کہ روح اور جسم، عبادت اور محنت، حق اللہ اور حقوق العباد — سب کے درمیان توازن قائم رکھو۔ یہی توازن اخلاقی پختگی اور سیرت کی سلامتی کی ضمانت ہے۔

فلسفیانہ اعتبار سے ارسطو کی "Golden Mean" کی تھیوری اسی حقیقت کی تعبیر ہے کہ ہر فضیلت دو انتہاؤں کے درمیان درمیانی راہ ہے۔ امام غزالیؒ نے بھی اخلاقی فضائل کی تشریح میں یہی تصور اختیار کیا کہ جب انسان اپنی قوتِ غضبیہ، شہوانیہ اور عاقلہ تینوں کو اعتدال میں رکھتا ہے تو عدل پیدا ہوتا ہے اور عدل تمام فضائل کی جڑ ہے۔

اعتدال دراصل انسان کے اندرونی نظم کا بیرونی مظہر ہے۔ جس کے دل میں توازن ہو وہ نہ خوشی میں مغرور ہوتا ہے نہ غم میں مایوس، نہ دولت پر فخر کرتا ہے نہ فقر پر حسرت۔ اس کے نزدیک کامیابی صرف یہ ہے کہ وہ اللہ کی رضا کے مطابق زندگی بسر کرے۔ یہی وہ سکون ہے جو ظاہری آسایش سے نہیں بل کہ اندرونی ہم آہنگی سے پیدا ہوتا ہے۔

دورِ حاضر میں انسان توازن کھو چکا ہے۔ وہ معلومات میں تو آگے بڑھ گیا ہے مگر حکمت میں پیچھے رہ گیا ہے۔ اس کی دوڑ تیز ہے مگر منزل گم۔ اعتدال کے بغیر ترقی بھی تباہی بن جاتی ہے اور آزادی بھی انتشار۔ اس لیے تعمیرِ اخلاق کا سب سے اہم اصول یہ ہے کہ انسان ہر معاملے میں میانہ روی اختیار کرے: خیر الامور اوسطھا.

''بہترین کام وہ ہے جس میں میانہ روی ہو۔''

اعتدال کا راستہ دینی معاملات میں بھی نہیں چھوڑنا چاہیے؛ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

»إِنَّ الدِّينَ يُسْرٌ، وَلَنْ يُشَادَّ الدِّينَ أَحَدٌ إِلَّا غَلَبَهُ، فَسَدِّدُوا وَقَارِبُوا وَأَبْشِرُوا« (صحیح البخاری حدیث نمبر 39)

بے شک دین آسان ہے اور جو شخص دین میں سختی اختیار کرے گا تو دین اس پر غالب آجائے گا (اور اس کی سختی نہ چل سکے گی) پس (اس لیے) اپنے عمل میں پختگی اختیار کرو۔ اور جہاں تک ممکن ہو میانہ روی برتو اور خوش ہو جاؤ۔

توازن اور اعتدال انسان کے باطن میں عدل اور سکون پیدا کرتے ہیں۔ یہی وہ وصف ہے جو انسان کو افراط و تفریط سے نکال کر اعتدال کی شاہراہ پر قائم رکھتا ہے جہاں نہ غرور کی جگہ ہے نہ پستی کی۔ یہی راہ انسانیت کی اصل راہ ہے۔

3.5-عادتوں کی تربیت(Habit Formation)

اخلاقی اصلاح محض خیالات یا اصولوں کا نام نہیں بل کہ یہ عادتوں کی مسلسل تربیت سے پیدا ہوتی ہے۔ انسان کا کردار اس کے وقتی فیصلوں سے نہیں بل کہ روزمرہ کے معمولات سے بنتا ہے۔ جو عمل بار بار کیا جائے وہ طبیعت کا حصہ بن جاتا ہے، اور جو طبیعت کا حصہ بن جائے وہی اخلاق کہلاتا ہے۔ اس لیے اگر کوئی شخص اپنی عادتوں کی اصلاح کرلے تو گویا اس نے اپنے اخلاق کی بنیاد درست کرلی۔

اسلام نے عبادات کو اسی لیے ایک نظامِ عادت کے طور پر قائم کیا ہے۔ نماز، روزہ، زکات اور دیگر اعمال محض رسمی عبادات نہیں بل کہ نظم و ضبط کی وہ مسلسل مشق ہیں جو انسان کو نیکی کا عادی بناتی ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

»أَحَبُّ الأَعْمَالِ إِلَى اللَّهِ أَدْوَمُهَا وَإِنْ قَلَّ« (صحیح بخاری، حدیث 6464)

''اللہ کے نزدیک سب سے محبوب عمل وہ ہے جو مسلسل کیا جائے اگرچہ کم ہو۔''

یہ ارشاد عادت کی اصلاح کی گہرائی کو ظاہر کرتا ہے کہ نیکی کا اثر کمیت میں نہیں بل کہ تسلسل میں ہے۔

عادتوں کی تربیت کا آغاز چھوٹی چیزوں سے ہوتا ہے: سچ بولنے کی عادت، صفائی کا اہتمام، وعدہ پورا کرنا، وقت کی پابندی اور نرم گفت گو۔ یہ چھوٹی عادتیں انسان کی شخصیت میں بڑے اخلاقی اوصاف پیدا کرتی ہیں۔ انسان اگر ان معمولی باتوں کو مسلسل اختیار کرے تو اس کا باطن خود بہ خود سنور جاتا ہے۔

فلاسفہ نے اخلاق کو "نیک عادتوں کا مجموعہ" کہا ہے۔ ارسطو کے نزدیک فضیلت ایک "Habitual Excellence" ہے، یعنی نیکی اس وقت پختہ ہوتی ہے جب وہ عادت بن جائے۔ امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں یہی بات یوں بیان کی ہے کہ "نفس جب بار بار نیک عمل کرتا ہے تو اس پر نیکی کی مہر لگ جاتی ہے۔" گویا عادت یا دوسرے لفظوں میں مجاہدہ وہ دہلیز ہے جہاں نظریہ عمل میں اور علم کردار میں بدل جاتا ہے۔

جدید نفسیات بھی اسی حقیقت کی تصدیق کرتی ہے کہ انسان کی زیادہ تر روزمرہ سرگرمیاں عادتوں سے منسلک ہوتی ہیں۔ اگر عادات منفی ہوں تو اخلاقی اصول کم زور پڑ جاتے ہیں، اور اگر وہ مثبت ہوں تو نفس کی اصلاح آسان ہو جاتی ہے۔ اس لیے اصلاحِ اخلاق کا حقیقی میدان "عادتوں کی تعمیر" ہے، جہاں صبر، شکر، دیانت اور ضبط جیسے اوصاف کو روزمرہ کے معمول میں بدلنا ہوتا ہے۔

عادت کی تربیت میں سب سے اہم چیز استقامت ہے۔ انسان بسا اوقات نیکی کا آغاز تو کرتا ہے مگر اس پر قائم نہیں رہتا۔ وہ جلدی نتائج چاہتا ہے حالاں کہ اخلاقی تربیت ایک تدریجی عمل ہے۔ مسلسل مشق سے نیکی فطرت بن جاتی ہے اور یہی فطرت صالح کردار کی پہچان ہے۔

پس جو شخص اپنی عادتوں کو نیکی کے سانچے میں ڈھال لے، اس کے لیے رذائل کے دروازے خود بخود بند ہو جاتے ہیں۔ عادت اگر سنور جائے تو اخلاق سنورتے ہیں، اور اخلاق سنور جائیں تو زندگی خود روشنی بن جاتی ہے۔

3.6- محاسبۂ نفس (Self-Reflection)

اصلاحِ اخلاق کا سب سے مؤثر اور ضروری طریقہ محاسبۂ نفس ہے۔ یہ وہ آئینہ ہے جس میں انسان اپنے باطن کو دیکھتا ہے اور اپنے اعمال کا جائزہ لیتا ہے۔ جو شخص روزانہ اپنے دل اور عمل کی جانچ نہیں کرتا وہ آہستہ آہستہ اپنے ضمیر کی آواز سننا چھوڑ دیتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

»الکَیِّسُ مَن دَانَ نَفْسَہُ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ المَوْتِ«(سنن ترمذی، حدیث 2459)

''عاقل وہ ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ کرے اور موت کے بعد کی زندگی کے لیے عمل کرے۔''

محاسبہ دراصل خود آگاہی اور جواب دہی کا باطنی احساس ہے۔ جب انسان یہ یقین رکھتا ہے کہ اس کے ہر قول و عمل کو اللہ دیکھ رہا ہے تو وہ اپنے رویّے میں احتیاط پیدا کرتا ہے۔ یہی ایمانِ مراقبہ انسان کے دل میں وہ بیداری پیدا کرتا ہے جو اسے برائی سے روکتی اور نیکی پر آمادہ کرتی ہے۔ قرآن مجید نے اسی شعور کو بیدار کرنے کے لیے فرمایا:

﴿یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا اتَّقُوا اللهَ وَلْتَنظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ﴾(سورۃ الحشر، آیت 18)

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور ہر شخص دیکھے کہ اس نے کل کے لیے کیا آگے بھیجا ہے۔''

یہی آیتِ مبارکہ محاسبۂ نفس کا قرآنی منشور ہے۔ اس میں انسان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے آنے والے کل پر نظر ڈالے، یعنی اپنے اعمال کے انجام پر غور کرے۔ جب انسان اپنے کل کا سوچتا ہے تو اس کا آج سنور جاتا ہے۔

محاسبہ صرف گناہوں پر ندامت کا نام نہیں بل کہ یہ ایک مثبت تربیتی عمل ہے۔ انسان اپنی نیکیوں کا بھی جائزہ لیتا ہے کہ وہ کس نیت سے کی جا رہی ہیں۔ کبھی نیکی بھی ریاکاری کی آمیزش سے خراب ہو جاتی ہے۔ اس لیے صالح انسان وہ ہے جو نیکی کے بعد بھی دل میں خوف رکھتا ہے کہ کہیں میری نیت میں کھوٹ تو نہیں۔ قرآن نے اسی حالت کو مومنین کی علامت قرار دیا:

﴿وَالَّذِینَ یُؤْتُونَ مَا آتَوا وَّقُلُوبُهُمْ وَجِلَةٌ أَنَّهُمْ إِلَىٰ رَبِّهِمْ رَاجِعُونَ﴾

(سورۃ المؤمنون، آیت 60)

''اور وہ لوگ جو دیتے ہیں جو کچھ بھی دیتے ہیں مگر ان کے دل اس خوف سے لرزاں رہتے ہیں کہ وہ اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں۔''

محاسبۂ نفس انسان کو غرور سے بچاتا ہے اور اس میں مسلسل اصلاح کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ جو شخص اپنے دل میں یہ عادت ڈال لے کہ وہ دن کے اختتام پر اپنے اعمال کا جائزہ لے، وہ خود کو دھوکے سے محفوظ رکھتا ہے۔ یہی وہ روحانی نظم ہے جو ضمیر کو بیدار اور دل کو نرم رکھتا ہے۔

حضرت عمر بن خطابؓ فرمایا کرتے تھے:

»حاسِبُوا أَنفُسَكُم قَبْلَ أَن تُحَاسَبُوا، وَزِنُوهَا قَبْلَ أَن تُوزَنُوا«

''اپنے نفس کا محاسبہ کرو قبل اس کے کہ تمھارا محاسبہ کیا جائے، اور اپنے اعمال کو تول لو قبل اس کے کہ وہ تولے جائیں۔''

یہ قول اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ دنیا میں خود احتسابی اختیار کرنے والا آخرت میں آسانی پاتا ہے۔

پس محاسبۂ نفس ایمان کی بیداری اور اخلاقی پختگی کی علامت ہے۔ جو دل اپنے آپ سے سوال کرتا رہتا ہے وہ کبھی مردہ نہیں ہوتا، اور جو اپنے باطن پر نگاہ رکھے وہ اللہ کے نزدیک ہمیشہ بیدار دلوں میں شمار ہوتا ہے۔

3.7- مثالی شخصیات کی پیروی

اصلاحِ اخلاق کے مؤثر ترین ذرائع میں سے ایک **نمونۂ کردار** ہے۔ انسان کتابوں سے علم حاصل کرتا ہے، مگر کردار زندہ مثالوں سے بنتا ہے۔ نظریہ ذہن کو متاثر کرتا ہے، مگر کردار دل کو بدل دیتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیا کو محض معلّم نہیں بل کہ مجسّم نمونہ بنا کر بھیجا تاکہ انسان نیکی کو صرف سن نہ لے، بل کہ دیکھ بھی لے۔

قرآنِ مجید نے حضورِ اکرم ﷺ کی سیرت کو انسانی اخلاق کا کامل معیار قرار دیا ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَن كَانَ يَرْجُو اللهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللهَ كَثِيرًا﴾ (سورۃ الأحزاب، آیت 21)

''یقیناً تمھارے لیے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ موجود ہے، ان کے لیے جو اللہ اور آخرت کی امید رکھتے ہیں اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے ہیں۔''

یہ آیت اس اصول کو واضح کرتی ہے کہ اخلاقی تربیت کا سب سے مؤثر ذریعہ نمونہ ہے نہ کہ محض وعظ۔ نبی کریم ﷺ کی حیاتِ طیبہ اسی اخلاقی کمال کی زندہ تفسیر ہے۔ ان کی صداقت، امانت، عدل، حلم، رحم اور بردباری وہ اوصاف ہیں جنھوں نے ایک جاہل اور پست قوم کو اخلاقی بلندی پر پہنچا دیا۔

نمونۂ کردار کی اہمیت صرف انبیا تک محدود نہیں۔ تاریخ میں انبیا کے وارث علما، صلحا، مصلحین اور مفکرین نے بھی اپنی عملی زندگی سے اخلاقی اصلاح کے چراغ جلائے۔ حضرت عمرؓ کا عدل، حضرت عثمانؓ کی سخاوت، حضرت علیؓ کا علم، امام حسنؓ کا حلم، اور امام حسینؓ کا عزم وہ کردار ہیں جو ہر دور کے انسان کو راہ دکھاتے ہیں۔

صوفیہ کا کہنا ہے کہ ''نفس کی تربیت کے لیے سب سے مؤثر طریقہ یہ ہے کہ انسان کسی صالح شخص کی صحبت اختیار کرے، کیوں کہ نظر کا اثر زبان کے اثر سے زیادہ ہوتا ہے۔'' واقعہ یہی ہے کہ انسان اس سے زیادہ سیکھتا ہے جو وہ دیکھتا ہے نہ کہ جو وہ سنتا ہے۔ اسی لیے صوفیہ نے صحبتِ صالحین کو تزکیۂ نفس کی بنیاد قرار دیا۔

جدید نفسیات بھی اسی حقیقت کی تائید کرتی ہے کہ مثالی شخصیات (Role Models) انسانی شخصیت کی تشکیل میں بنیادی کردار رکھتی ہیں۔ بچہ ہو یا جوان، وہی عمل دہراتا ہے جو وہ اپنے ارد گرد دیکھتا ہے۔ اگر معاشرے میں دیانت دار، منصف مزاج اور رحم دل لوگ نمایاں ہوں تو پورا معاشرہ نیک بن جاتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

»إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الأَخْلاَقِ«(موطا امام مالک، حدیث 1614)

''مجھے تو صرف اس لیے بھیجا گیا ہے کہ اخلاق کے اعلیٰ معیار کو مکمل کر دوں۔''

یہ ارشادِ نبوی ہمیشہ کے لیے واضح کر دیتا ہے کہ اسلام کی دعوت دراصل کردار کی دعوت ہے۔ تبلیغ کا سب سے مؤثر انداز وہ ہے جس میں کردار خود بولتا ہے۔

پس ہر انسان کو اپنی زندگی میں کوئی نہ کوئی صالح نمونہ رکھنا چاہیے تاکہ وہ خود کو اس کے اخلاقی معیار کے قریب لا سکے۔ یہی اتباع اور اقتدا اخلاقی بلندی کی راہ ہے۔ انسان جب کسی کامل سیرت کے نور سے اپنی روشنی حاصل کرتا ہے تو اس کا دل بھی منور اور کردار بھی معتبر ہو جاتا ہے۔

3.8- نیکی کا معاشرتی فروغ

اخلاق صرف فرد کی ذاتی صفت نہیں، یہ ایک سماجی رویّہ بھی ہے۔ انسان جس معاشرے میں رہتا ہے وہاں کے رجحانات، اقدار اور ماحول اس کے کردار پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ اگر معاشرے میں نیکی کی حوصلہ افزائی اور بدی کی مذمت کا رواج ہو تو انسان کے لیے خیر پر قائم رہنا آسان ہو جاتا ہے، مگر اگر بدی کو ہنر اور نیکی کو کم زوری سمجھا جانے لگے تو مضبوط سے مضبوط ضمیر بھی ڈگمگا جاتا ہے۔

اسلامی اخلاقیات میں فرد اور معاشرے کے تعلق کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے۔ قرآن مجید نے امتِ مسلمہ کو ''خیر امت'' اس لیے کہا ہے کہ وہ صرف نیکی کرنے والی نہیں، بل کہ نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے والی ہے:

﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ﴾

(سورۃ آل عمران، آیت 110)

''تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے پیدا کی گئی ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔''

یہ آیت بتاتی ہے کہ معاشرے میں نیکی کا فروغ محض انفرادی نہیں، بل کہ اجتماعی ذمہ داری ہے۔ اگر سماج صالح اقدار کی پشت پناہی کرے تو اخلاقی فضا قائم رہتی ہے۔ یہی وہ ''سماجی تقویت'' ہے جس سے نیک عمل کو دوام اور بدی کو مزاحمت حاصل ہوتی ہے۔

تاریخ میں وہی معاشرے اخلاقی طور پر مضبوط رہے جن میں اجتماعی ضمیر زندہ تھا، جہاں ظلم کے خلاف آواز بلند کرنا نیکی سمجھا جاتا تھا اور جھوٹ پر خاموشی کو گناہ۔ مگر جب سماج نے سچ بولنے والے کو تنہا چھوڑ دیا وہاں اخلاقی اقدار مٹ گئیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

»مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ وَذَلِكَ أَضْعَفُ الإِيمَانِ«

(صحیح مسلم، حدیث 49)

''جو تم میں سے کسی برائی کو دیکھے وہ اسے اپنے ہاتھ سے روکے، اگر ایسا نہ کر سکے تو زبان سے، اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو دل میں برا جانے، اور یہ ایمان کا کم زور ترین درجہ ہے۔''

یہ تعلیم فرد کے ضمیر کو معاشرتی فریضے سے جوڑتی ہے۔ جب ہر شخص خیر کے فروغ میں اپنا حصہ ڈالے تو پورا معاشرہ اصلاح کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

جدید سماج میں ''Social Reinforcement'' سے مراد یہ ہے کہ نیک عمل کو سماجی سطح پر سراہا جائے، نمایاں کیا جائے اور اس کی تقلید کی جائے۔ اگر معاشرہ جھوٹے، بد دیانت اور متکبر شخص کو عزت دے گا تو سچائی اور دیانت مٹ جائیں گی۔ لیکن اگر نیک اور با کردار افراد کو عزت و اعتماد ملے تو نیکی کو اخلاقی توانائی حاصل ہو گی۔

سماجی تقویت دراصل اجتماعی محاسبہ ہے۔ اس کے بغیر انفرادی اصلاح ادھوری رہتی ہے۔ جب ایک معاشرہ خیر کو اپنا معیار بنالیتا ہے تو وہاں برائی خود بہ خود کمزور پڑ جاتی ہے۔ یہی وہ منزل ہے جہاں اخلاقی اصول صرف فرد کی ذات میں نہیں، پورے سماج میں سانس لیتے ہیں۔

3.9- مقصدِ حیات سے ہم آہنگی (Purpose Alignment)

انسان کی زندگی اس وقت متوازن اور با معنی بنتی ہے جب اس کے اعمال اور ارادے اس کے مقصدِ حیات کے مطابق ہوں۔ اگر زندگی کا کوئی بلند مقصد نہ ہو تو اخلاقی اصول محض روایات بن جاتے ہیں۔ نیکی تب ہی پختہ ہوتی ہے جب وہ کسی اعلیٰ مقصد سے وابستہ ہو۔ وہ مقصد اللہ کی رضا، آخرت کی کام یابی، اور انسانیت کی خدمت ہے۔

قرآن مجید نے انسان کو یاد دلایا:

أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ (سورۃ المؤمنون، آیت 115)

''کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تمھیں عبث پیدا کیا اور تم ہماری طرف نہیں لوٹائے جاؤ گے؟''

یہ آیت اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ انسان کا وجود کسی حادثے یا کھیل کا نتیجہ نہیں بل کہ ایک ذمہ دارانہ مقصد کے ساتھ وابستہ ہے۔

اخلاقی اصلاح اسی وقت مؤثر ہوتی ہے جب انسان یہ سمجھے کہ اس کا ہر عمل اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے۔ اگر یہ احساس کم زور پڑ جائے تو نیکی رسمی اور برائی معمول بن جاتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

»الكَيِّسُ مَن دَانَ نَفْسَهُ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ المَوْتِ« (ترمذی، حدیث 2459)

''عاقل وہ ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ کرے اور موت کے بعد کی زندگی کے لیے عمل کرے۔''

یہ حدیث بتاتی ہے کہ اخلاق کا سرچشمہ صرف سماجی دباؤ یا شخصی عادت نہیں، بل کہ آخرت کی شعوری فکر ہے۔

مقصدِ حیات سے غافل انسان نیکی کے فلسفے پر بحث تو کر سکتا ہے مگر نیکی کے جذبے سے محروم رہتا ہے۔ جب انسان کے دل میں یہ یقین جاگزیں ہو کہ اس کی زندگی ایک امانت ہے اور اسے اپنے خالق کے حضور جواب دہ ہونا ہے تو اس کے فیصلے خود بخود سنور جاتے ہیں۔ یہی یقین اس کے کردار کو استقامت دیتا ہے اور نیت کو خلوص۔

اخلاقی نظام اس وقت پائیدار بنتا ہے جب فرد کے دل میں مقصد اور عمل کا رشتہ مضبوط ہو۔ جو شخص اپنی زندگی کو اللہ کی رضا کے تابع کر دیتا ہے وہ حالات کے بدلنے سے نہیں بدلتا۔ یہی وہ ہم آہنگی ہے جو انسان کو رذائل سے محفوظ اور خیر پر ثابت قدم رکھتی ہے۔ قرآن کا یہ ارشاد اسی ہم آہنگی کی ترجمانی کرتا ہے:

﴿قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ (سورۃ الانعام، آیت 162)

''کہہ دیجیے میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت سب اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔''

پس جب انسان اپنے مقصدِ حیات کو پہچان لیتا ہے تو اس کی اخلاقی زندگی میں وحدت پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر وہ خیر کو وقتی فائدے کے لیے نہیں، ابدی کامیابی کے لیے اختیار کرتا ہے۔ یہی شعورِ مقصد اخلاق کو محض اصول نہیں، ایمان کی حقیقت بنا دیتا ہے۔

4.-خلاصہ

انسان کی اصل عظمت اس کے علم یا قوت میں نہیں، اس کے اخلاق میں ہے۔ یہی اخلاق اس کے باطن کا آئینہ اور اس کی روح کی ترجمانی پیش کرتا ہے۔ رذائلِ اخلاق انسان کے دل کو زنگ آلود کر دیتے ہیں اور اسے اپنی فطری روشنی سے محروم کر دیتے ہیں۔ اصلاحِ اخلاق دراصل اس زنگ کو دور کرنے اور انسان کو اس کی اصل فطرت کی طرف لوٹانے کا نام ہے۔

اس یونٹ میں ہم نے مطالعہ کیا کہ بدی انسان کے اندر پیدا ہونے والا بگاڑ ہے، جس کی جڑ ضبطِ نفس کی کم زوری، غلط تربیت، ماحول کی خرابی، مادہ پرستی، اور مقصدِ حیات سے غفلت میں ہے۔ انسان جب اپنے اندر کا توازن کھو دیتا ہے تو وہ اپنی عقل، خواہش، اور ارادے کے درمیان ہم آہنگی برقرار نہیں رکھ پاتا۔ یہی عدمِ توازن اس کے کردار کو کم زور اور سماج کو بے سمت بنا دیتا ہے۔

اصلاحِ اخلاق کا عمل اسی بگاڑ کے علاج کا نام ہے۔ یہ علاج محض نصیحت یا قانون سے نہیں بل کہ خود شناسی، ضبط، خیر کی محبت، توازن، عادتوں کی تربیت، محاسبۂ نفس اور مثالی شخصیات کی پیروی سے ہوتا ہے۔ ان اصولوں پر استقامت انسان کے اندر وہ اخلاقی قوت پیدا کرتی ہے جو رذائل کے مقابلے میں ڈھال بن جاتی ہے۔

اسلامی تعلیمات کے مطابق نیکی کا سرچشمہ اللہ کا شعور اور آخرت کی جواب دہی ہے۔ جب انسان یہ مان لیتا ہے کہ وہ اللہ کا بندہ اور دنیا میں امانت دار ہے تو اس کا ہر عمل عبادت بن جاتا ہے۔ قرآنِ مجید نے اسی حقیقت کو

ان الفاظ میں سمیٹا ہے:

﴿قَدۡ اَفۡلَحَ مَن زَكّٰىهَا وَقَدۡ خَابَ مَن دَسّٰىهَا﴾ (سورۃ الشمس، آیات 9-10)

''کام یاب ہوا وہ جس نے اپنے نفس کو پاک کیا، اور نامراد ہوا وہ جس نے اسے آلودہ کر لیا۔''

یہ آیت انسانی اخلاق کی ابدی اساس بیان کرتی ہے۔ تزکیۂ نفس ہی وہ راہ ہے جس سے انسان اپنے باطن کو سنوارتا، اپنے کردار کو مضبوط کرتا اور اپنے خالق کے قریب ہوتا ہے۔ جب فرد کے دل میں یہ تطہیر پیدا ہو جاتی ہے تو اس کی روشنی پورے معاشرے کو منور کر دیتی ہے۔

آخر کار یہی حقیقت سامنے آتی ہے کہ تعمیرِ شخصیت کا عمل دراصل تعمیرِ باطن کا عمل ہے۔ انسان اگر اپنے اندر خیر، ضبط، محبت، اور توازن پیدا کر لے تو اس کی زندگی خود دعوت بن جاتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اخلاق مذہب کا چہرہ بن جاتا ہے اور انسانیت اپنی اصل بلندی کو پا لیتی ہے۔

خود آزمائی

1. رذائلِ اخلاق سے کیا مراد ہے؟ ان کی بنیادی اقسام بیان کیجیے۔
2. ضبطِ نفس کی کم زوری انسان کے اخلاق پر کس طرح اثرانداز ہوتی ہے؟
3. غلط تربیت اور فکری بگاڑ اخلاقی زوال میں کس طرح کردار ادا کرتے ہیں؟
4. مادہ پرستی اور اخلاقی نسبیت کو جدید معاشرتی زوال کے بڑے اسباب کیوں کہا جاتا ہے؟
5. اصلاحِ اخلاق کے بنیادی اصول کون سے ہیں؟
6. خود شناسی کو اخلاقی تربیت کی بنیاد کیوں قرار دیا جاتا ہے؟
7. خیر کی محبت انسان کے کردار میں کس طرح پختگی پیدا کرتی ہے؟
8. عادتوں کی تربیت اخلاقی اصلاح میں کیا کردار ادا کرتی ہے؟
9. محاسبۂ نفس سے مراد کیا ہے؟ قرآن و سنت کی روشنی میں وضاحت کیجیے۔
10. مثالی شخصیات کی پیروی اصلاحِ اخلاق میں کیوں ضروری ہے؟
11. نیکی کے معاشرتی فروغ کے لیے فرد اور سماج کو کیا کردار ادا کرنا چاہیے؟
12. مقصدِ حیات سے ہم آہنگی کو اخلاقی پختگی کے لیے لازمی کیوں کہا گیا ہے؟
13. قرآنِ مجید کے مطابق کام یابی اور ناکامی کا معیار کیا ہے؟ (سورۃ الشمس کی آیات 9-10 کے حوالے سے وضاحت کیجیے۔)
14. آپ کے نزدیک اخلاقی اصلاح کے عمل میں سب سے بنیادی رکاوٹ کیا ہے اور اس کا حل کیا ہو سکتا ہے؟